شبلی شکنی کی روایت

اور دوسرے مضامین

خالد ندیم

نشریات

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: 0321-4589419

ترتیب

مقالات:

تقدیم

جب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کو قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد کی ذمہ داری سونپی گئی تو ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اپنے خط میں ڈاکٹر بلوچ کو لکھا:

> ہم اورینٹل کالج (لاہور) کے فیض یاب لوگ اصلاً مؤرخ ہی ہیں...... تاریخ ہمارا قومی مضمون ہے، مگر ہم یہ دیکھ کر متاسف ہوتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد، ہم نے دین کے بعد اپنے سب سے اہم اور ضروری مضمون 'تاریخ' کی طرف توجہ نہیں کی۔ برطانوی تعلیم نے ہمیں تاریخ کے بارے میں بے حس بنا دیا۔ انگریزوں نے ایلیٹ اور ڈاوسن پیدا کیے؛ ہندوؤں نے سرکار، ایشوری پرشاد، قانون گو، بنی پرشاد وغیرہ ابھارے۔ ہمارے یہاں شبلی ایک دبستان کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے، لیکن پیچھے پھینک دیے گئے اور کوئی بڑا کام نہ ہو سکا۔
>
> (خطوط مشاہیر بنام نبی بخش بلوچ، مرتبہ محمد راشد شیخ، حیدرآباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲۸)

اس مختصر بیانیے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے جنوبی ایشیا میں نو آبادیاتی دور میں اور اس کے بعد، تاریخ نگاری کے حوالے سے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور ہم نے شبلی کے ساتھ کیا کیا، اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔

....

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کے نہ سال پیدائش کو کوئی بھول سکتا ہے، نہ سال وفات کو۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے حوالے سے ۱۸۵۷ء وہ سال تھا، جب ان کی مایوسی انتہا پر تھی اور ۱۹۱۴ء وہ سال تھا، جب صرف جنوبی ایشیا کے مسلمان ہی نہیں، بلکہ پوری امت

مسلمہ شکست و درماندگی کے نصف النہار پر تھی۔ زوال و شکستگی کی اس صدی میں شبلی جیسے نابغۂ روزگار کا پیدا ہونا، زیست کرنا اور امکانات کی ایک دنیا آباد کرنا، اہم واقعہ ہے۔

شبلی کی پہچان کے کئی حوالے ہیں۔ عالم، متکلم، مؤرخ، ادیب، شاعر، مصنف اور مصنف گر، بلکہ اپنی ذات میں ایک ادارہ، ایک انجمن۔ شبلی کی تحریروں کے اثرات صرف ادب پر ہی نہیں پڑے، بلکہ عہد کی فکری اور ذہنی زندگی پر بھی پڑے۔ ایک نہیں، کئی نسلوں کی ذہنی تشکیل میں شبلی کا حصہ ہے۔ شبلی کی شہرت سب سے زیادہ ایک مؤرخ اسلام کی حیثیت سے ہے۔ انھوں نے صرف اسلامی تاریخ بیان کرنے سے ہی غرض نہیں رکھی، بلکہ مستشرقین اور بعض متعصب مؤرخین کے ان اعتراضات کا مدلل اور محققانہ جواب بھی دیا ہے، جو انھوں نے اسلامی تاریخ اور تہذیب و ثقافت پر لگائے۔

شبلی کے لوحِ مزار پر سیّد سلیمان ندوی کا جو قطعہ تاریخ کندہ ہے، اس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

سعدیِ عصر و غزالیِ زماں ، خلدونِ وقت

اس محبت اور عقیدت سے قطع نظر، جس نے ندوی سے شبلی کے لیے یہ قطعۂ تاریخ کہلوایا، تاریخ کے حوالے سے وہ ابن خلدون نہیں تھے، شبلی تھے۔ اپنی شناخت آپ اور تاریخ نگاری کے سفر میں ایک اہم سنگ میل۔ شبلی کی عظمت اس میں تھی کہ انھوں نے اپنے عہد کے تقاضوں کو پہچانا۔ جس طرح غزالی کو ان کے عہد نے غزالی بنایا، اسی طرح شبلی کو ان کے عہد نے شبلی بنادیا، تاہم ہر بڑے انسان کی طرح شبلی پر عقیدت و محبت کے پھول بھی برسائے گئے اور طنز و تشنیع کے تیر بھی۔ ایک طرف ثناخوانِ شبلی انھیں قدیم و جدید کا امتزاج، روایت پسندی اور عقلیت کا سنگم، جامع الکمالات، یکتائے روزگار اور ایک دبستانِ فکر و ادب کا بانی قرار دیتے ہیں، جس نے انتہائی زوال کے زمانے میں اپنی تاریخ کو مینارۂ نور بنا کر نسلِ نو کو حیاتِ تازہ عطا کی تو دوسری طرف ناقدانِ شبلی نے، جن میں بعض بڑے بڑے

علمائے عصر بھی ہیں، شبلی پر اعتراضات کیے اور اس حوالے سے ان کے صرف ذاتی عیوب ہی بیان نہیں کیے گئے، بلکہ ان کی فکر و ادب، تاریخ نگاری اور کلام سب کو نشانہ بنایا گیا۔ اور شبلی پر الزامات کی ایک طویل فہرست مرتب ہوگئی۔

....

زیرِ نظر کتاب میں شبلی شکنی کی اس روایت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر خالد ندیم، جو پاکستان میں 'شبلی شناسی' کے حوالے سے بھی ایک اہم نام ہے، بڑی دل سوزی اور دل جمعی سے سنجیدہ تحقیق میں مصروف ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر خالد ندیم کے متفرق مقالات کا مجموعہ ہے، جن میں ایک معنوی ربط نے کتاب کا قالب اختیار کرلیا۔ شبلی صدی (۲۰۱۴ء) کے آغاز میں ان کی کتاب شبلی کی آپ بیتی سامنے آئی تھی، پھر اردو ترجمہ مکاتیب شبلی اور اب اسی تسلسل میں شبلی شکنی کی روایت۔ اُمید ہے، اہلِ علم سے دادِ تحسین وصول کرے گی۔

....

شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کسی کی برسی پر یا برسی کی صدی پر اس کی قبر پر پھول چڑھا دینے اور عرقِ گلاب انڈیل دینے سے تعلق کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ شبلی صدی کا تقاضا ہے کہ ایک 'شبلی عصر' پیدا کیا جائے اور اس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ شبلی کو فراموش نہ ہونے دیا جائے۔

نگار سجاد ظہیر
(سابق صدر شعبہ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی)
کراچی: پیر، ۲۵؍اپریل ۲۰۱۶ء

پیش لفظ

میرے لیے شبلی پر لکھنے کا جواز پیش کرنا ذرا مشکل سی بات ہے، وہ اس لیے کہ مَیں اپنے تئیں شبلی شناسی کی راہ میں پہلے قدم پر پاتا ہوں۔ پھر یہ جسارت کیوں کی، اس کا جواب محض یہ ہے کہ مَیں کسی بھی فنکار کی بے جا مخالفت کو ادبی بددیانتی تصور کرتا ہوں۔ مَیں کسی طور شبلی کا وکیل نہیں اور نہ ہی اس کا اہل ہوں، لیکن جہاں کہیں شبلی نعمانی کی ذات یا علمی کارناموں پر تنقیص ہوتی ہے، مَیں تڑپ اُٹھتا ہوں۔ ادبی تنقید سے کسے مفر ہے اور کون ہے، جو اس سے مستثنیٰ ہو، لیکن شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کو ادبی تنقید کا سامنا نہیں، بلکہ ان پر ہونے والی تنقید کا تعلق ذاتی تعصبات سے ہے۔

علامہ شبلی کا المیہ ان کی مخالفت سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ انھیں اپنوں کی محبت نے بھی روند ڈالا ہے۔ انھیں زندگی میں پہلا دُکھ اُس وقت ملا، جب ان کے والد نے دوسری شادی کر لی اور ان کی والدہ اس صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے وفات پا گئیں۔ وہ زندگی بھر مخالف ماحول سے نبرد آزما رہے، حتیٰ کہ زندگی کے آخری ایام میں انھیں اپنے ہی لگائے ہوئے پودے کی چھاؤں سے اُٹھ کر اعظم گڑھ آنا پڑا، اس کے باوجود انھوں نے حوصلہ نہ ہارا اور شدید علالت کی حالت میں دارالمصنفین جیسے تاریخ ساز ادارے کی فکری اساس رکھ دی۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی کے علمی و ادبی کارناموں کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ اوّلین کاوشوں میں بہت کچھ گنجائش رہ جاتی ہے اور یہی بات

علامہ شبلی کی تصانیف میں بھی ہے، لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تحقیق، ادبی تاریخ اور علمِ کلام کے سلسلے میں شبلی کو خود ہی راستہ تلاش کرنا اور خود ہی طے کرنا تھا۔ واضح رہے کہ سیرت النبیؐ پر ان کے ہم عصر علما کی طرف سے اعتراضات کا تعلق تصنیف کے مندرجات سے زیادہ مصنف کی ذات سے تھا۔ دوسرا المیہ یہ ہوا کہ بعد کے اَدوار کے محققین و ناقدین نے شبلی کی تصانیف کو اپنے عہد اور اس کے جدید ذرائع کی کسوٹی پر پرکھنا چاہا، لامحالہ شبلی ان کے معیار پر پورا نہ اُتر سکے۔ حیرت ہے کہ مولوی عبدالحق کی تحریک پر شیخ محمد اقبال اور حافظ محمود شیرانی کی سخت تنقید کے باوجود شبلی کی ادبی حیثیت قائم رہی۔

شبلی پر تنقید کا علمی و ادبی رُخ کتنا ہی ناپسندیدہ ہو، اس کا کوئی نہ کوئی جواز پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن شبلی کے مخالفین نے اسی پر اکتفا نہ کی، بلکہ ان کی علمی کردار کشی میں ناکامی کے بعد ان کی ذات کو ہدفِ تنقید بنایا۔ اس حوالے سے محض مخالفین کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق، مولوی وحید الدین سلیم، منشی محمد امین زبیری، وحید قریشی اور شیخ محمد اکرام کا نام لیا جانا چاہیے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خود دارالمصنفین میں بعض نادان دوستوں کا کردار بھی کم نہ تھا۔ علامہ شبلی کے قرابت دار اقبال احمد سہیل کی طرف سے سیرتِ شبلی کو بزم سے رزم بنا دینے اور شاگردِ رشید سید سلیمان ندوی کی طرف سے بلاوجہ احتیاط نے ایک نیا میدان سجا دیا۔ علامہ شبلی کی رحلت ١٩١٤ء میں ہوئی اور مخالفت کا میدان ١٩٤٣ء میں سجا۔ انتیس برس بعد شبلی مخالف رویے کا جواز کیا ہو سکتا ہے؟ یہی وہ سوال ہے، جس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

زیرِ نظر مجموعے میں اگرچہ متفرق مقالات ہیں، لیکن ان میں ایک معنوی ربط ہے، اسی ربط کی وجہ سے انھیں یکجا کرنے کا خیال آیا۔ اب یہ قارئین پر ہے کہ وہ ان مقالات کو کیسا پاتے ہیں۔

ان مضامین کی اشاعت کے حق میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ مختلف رسائل و جرائد

میں ان کی اشاعت کے بعد اردو دنیا کے بعض ناموروں نے خطوط، ای میل اور ٹیلی فون کے ذریعے سے میری حوصلہ افزائی کی۔

اس مجموعے کی اشاعت کے لیے استاد گرامی پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)، ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی (علی گڑھ)، ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر (کراچی)، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی (اعظم گڑھ)، ڈاکٹر عمیر منظر (لکھنؤ)، ڈاکٹر اقبال مسعود (بھوپال)، ڈاکٹر شاہ نواز فیاض (دہلی) اور ڈاکٹر محمد حسن کلیم (شیخوپورہ) وقتاً فوقتاً ترغیب دیتے رہے۔ میں ان سب بزرگوں اور دوستوں کا شکرگزار ہوں۔

زیرِ نظر کتاب کی اشاعت کے موقع پر مجھے اپنے نہایت محترم دوست اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ اردو کے چیئر مین ڈاکٹر طیب منیر (اسلام آباد) شدت سے یاد آ رہے ہیں، جنھوں نے کتاب کا مسودہ پڑھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور ۲۲ رجون ۲۰۱۶ء کی دوپہر اس سے متعلق اپنی رائے قلم بند کر چکنے کی نوید بھی سنائی تھی؛ لیکن افسوس، اسی روز سہ پہر کے وقت گھر جاتے ہوئے ان کی کار ایک ٹرالر کی زد میں آ گئی اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گئے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم واقعتاً ایک علمی اور تہذیبی شخصیت تھے۔ چراغِ حسن حسرت، احوال و آثار، خطوطِ مشفق اور حسن یار کی باتیں ان سے یادگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ آمین

مجھے اپنے فاضل ناشر (جناب رفیع الدین حجازی) کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے، جو میری ناچیز کاوشوں کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے میں ہمیشہ ہی اشتیاق ظاہر کرتے رہے ہیں۔ حقیقت تو یہی ہے کہ حضورؐ بحیثیت سپہ سالار، شبلی کی آپ بیتی، آپ بیتی علامہ اقبال، جہانِ تلمیحات اور شبلی شکنی کی روایت انھی کی توجہ سے منظرِ عام پر آئیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں دنیا و آخرت کی تمام نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔

شبلی صدی کے آغاز میں شبلی کی آپ بیتی کے ساتھ حاضر ہوا تھا اور اب جب کہ یہ صدی

اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے، یہ مجموعہ پیش کر رہا ہوں۔ علامہ شبلی سے متعلق مجھے ابھی بہت کچھ لکھنا ہے، اس لیے ان تحریروں کو طفلِ مکتب سے منسوب سمجھا جائے۔

خالد ندیم
dr.khalidnadeem@gmail.com
+92-321-4433155

شبلی شکنی کی روایت

(پس منظر و پیش منظر)

علامہ شبلی پر ندوۃ العلما اور اس کے پس منظر میں جو تنقید، تنقیص یا ہنگامہ آرائی ہوئی، وہ اَب تاریخ کا حصہ ہے؛ لیکن ادبی دنیا میں بھی ان پر کچھ کم کیچڑ نہیں اُچھالا گیا۔ اگر چہ ان کی علمی و ادبی خدمات کو تسلیم کیا جا چکا ہے اور بطور شاعر، مورخ، نقاد، انشا پرداز اور دانشور ان کی صلاحیتیں مسلمہ ہیں، جس کا ثبوت ان کی رحلت کے ایک صدی بعد تک ان کی تصانیف کی متواتر اشاعت سے ملتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ابتدائی طور پر ظاہر ہونے والا شبلی مخالف رویہ بتدریج شبلی شکنی کی روایت میں بدل چکا ہے۔

ادبی دنیا میں علامہ شبلی کی اوّلین مخالفت مولوی عبدالحق کی طرف سے ہوئی، جو وقتاً فوقتاً اور جا و بے جا ان کے بارے میں ایسے جملے ادا کرتے رہے، جن سے شبلی کے بارے میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ ساتھ ہی ساتھ مولوی صاحب نے کوشش کر کے تصانیفِ شبلی کے بارے میں ایسی فضا تیار کی، جس سے شبلی کی علمی حیثیت مشکوک ہو جائے۔ یاد رہے کہ مولوی عبدالحق علی گڑھ میں شبلی کے شاگرد تھے اور بعد ازاں جس انجمن ترقی اردو کے وہ جنرل سیکرٹری ہوئے، شبلی نعمانی اس کے بانی سیکرٹری (جنوری ۱۹۰۳ء۔ فروری ۱۹۰۵ء) رہ چکے تھے، البتہ مولوی عبدالحق کا شخصی جھکاؤ مولانا الطاف حسین حالی کی طرف تھا، جو آہستہ آہستہ جانب داری سے جا ملا۔ وہ حالی و شبلی کے تعلقات کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ نہ کر

سکے اور حیات جاوید کو 'کتاب المناقب' اور 'مدلل مداحی' قرار دینے پر شبلی سے زندگی بھر برہم رہے، البتہ یہ بھول گئے کہ انھی شبلی نے حیات سعدی کو 'بے مثل' قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> دلچسپ بات یہ ہے کہ انجمن ہی نے شبلی پر ایسا خطرناک حملہ کیا کہ جس سے وقتی طور پر شبلی کی شہرت کو خاصا نقصان پہنچا۔ میری مراد ہے، شبلی کی شعرالعجم پر حافظ محمود شیرانی کے اُس طویل تنقیدی مضمون سے، جو انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے اردو میں قسط وار شائع ہوا اور بعد میں وہ طویل مضمون کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔ ایسے شواہد موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مضمون مولوی عبدالحق کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔[۱]

مولوی صاحب کی فرمائش یا ترغیب پر شعرالعجم پر حافظ محمود شیرانی کی طرف سے یہ تنقید، جسے تنقیص کہنا مناسب ہے، اردو کے متعدد شماروں (اکتوبر ۱۹۲۲ء، جنوری ۱۹۲۳ء، اپریل ۱۹۲۳ء، اکتوبر ۱۹۲۳ء، اپریل ۱۹۲۴ء، جنوری ۱۹۲۶ء اور اکتوبر ۱۹۲۹ء) میں شائع ہوئی۔ ان شماروں کا دورانیہ سات برسوں پر پھیلا ہوا ہے، جس سے مدیر و محقق کی مستقل مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی دوران میں منشی محمد امین زبیری کے مرتبہ خطوطِ شبلی کا مقدمہ لکھتے ہوئے مولوی صاحب نے اپنی خواہش کو پیشین گوئی کے طور پر بیان کیا، لکھتے ہیں:

> مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے 'نونی' لگنی شروع ہو گئی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا، وہ بہت سخت مزاج ہے، مگر آخری انصاف اُسی کے ہاتھ ہے۔ ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی۔[۲]

شبلی کی کتابوں کو تو 'نونی' نہ لگی، لیکن مولوی عبدالحق کے یہ تنقیدی جملے ان کی ناقدانہ حیثیت پر سوالیہ نشان ضرور لگا گئے۔

جس زمانے میں علامہ شبلی نعمانی ندوہ کے لیے سرگرم تھے، منشی محمد امین زبیری

(۱۸۷۰ء-۱۹۵۸ء) ریاست بھوپال میں صیغہ تاریخ کے مہتمم کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بیگم بھوپال کو ندوہ اور سیرت النبیؐ سے بہت دلچسپی تھی، چنانچہ ان منصوبوں کے لیے انھوں نے فراخ دلی سے اخلاقی اور مالی تعاون کیا۔ علامہ شبلی اور بیگم صاحبہ کے درمیان سفیر کی ذمہ داری امین زبیری ادا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں زبیری صاحب کے نام شبلی کے اکتیس خطوط دستیاب ہوئے ہیں، جو مکاتیب شبلی کی جلد اوّل میں شامل ہیں۔ ان تمام خطوط میں شبلی نے انھیں 'محبی' کے لفظ سے مخاطب کیا ہے اور خود امین زبیری کو شبلی سے بہت عقیدت تھی۔

سید سلیمان ندوی نے شبلی نعمانی کے مکاتیب پر مشتمل دو مجموعے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں مرتب کر دیے تھے۔ مرتب نے مکاتیب شبلی کی اشاعت کا خیال اکتوبر ۱۹۰۹ء کے الندوہ میں پیش کیا تھا، جس کے نتیجے میں ملک بھر سے ہزاروں خطوط جمع ہو گئے۔ مرتب کے مطابق 'جلد اوّل کے اکثر خطوط مولانا کی زندگی میں صاف ہو کر ان کی نظر سے گزر چکے تھے' لیکن اس کی اشاعت کا مرحلہ طے نہ ہو سکا۔ ۱۹۱۴ء میں شبلی کی رحلت کے بعد دوبارہ اعلان کیا گیا تو 'ہر طرف سے خطوط کی بارش' ہونے لگی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ہزاروں خطوط میں سے صرف دو مجموعے ہی کیوں مرتب ہو سکے، اس کا جواب سید سلیمان جلد اوّل کے دیباچے میں دیتے ہیں:

> مَیں نے صرف اُن خطوط کو انتخاب کیا ہے، جن سے یا تو مولانا کے ذاتی سوانح کا کوئی واقعہ ظاہر ہوتا ہے یا ان میں کسی علمی، اصلاحی اور قومی مسئلے کا ذکر ہے یا انشا پردازی کا ان میں کوئی نمونہ موجود ہے۔ ان ہی اصول ہائے ثلثہ کی رہبری سے ہزاروں خطوط کے انبار سے یہ چند دانے چھانٹ کر الگ کیے گئے ہیں، ورنہ ایک سچے مومن کے نزدیک تو قرآن کی سب سورتیں برابر ہی ہیں۔[۲]

خطوں کی جمع آوری کے لیے ان اعلانات اور ان کے جواب میں ہزاروں خطوط کی موصولی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات ملک بھر میں مشتہر ہوئی ہوگی، ایسے میں یہ بات تسلیم

کرنے میں تامل ہو سکتا ہے کہ عطیہ فیضی یا ان کی بہنیں اس خبر سے لاعلم رہی ہوں: البتہ عطیہ کے ۱۹۴۶ء کے مضمون سے، جس کا ذکر ذرا بعد آئے گا، معلوم ہوتا ہے کہ مکاتیب شبلی کی ترتیب کے دور میں سید سلیمان ندوی کو یہ خطوط دستیاب نہیں ہوئے تھے، ورنہ عطیہ کے نام شبلی کے یہ خطوط 'ذاتی سوانح'، 'علمی، اصلاحی اور قومی مسئلے' یا 'انشا پردازی' سے ایسے بے نیاز نہیں تھے کہ ان سے صرف نظر کیا جا سکتا: البتہ مرتب کے مذکورہ بالا اقتباس کے آخری جملے سے مکتوب نگار کی 'تقدیس' اور ان کی ذات اور کردار کی بابت مرتب کی احتیاط کا اندازہ لگایا جا سکتا۔ بہر حال، ان مجموعوں کی اشاعت کے برسوں بعد جب امین زبیری کو عطیہ فیضی اور زہرا بیگم کے نام شبلی کے خطوط کا علم ہوا تو انھوں نے ان کو مرتب کر کے شائع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا:

> جس وقت یہ نادر مجموعہ جناب زہرا بیگم صاحبہ اور جناب عطیہ بیگم صاحبہ کی عنایت سے میرے ہاتھوں تک پہنچا، اُسی وقت مَیں نے مکاتیب شبلی میں اس کی کو محسوس کیا اور خیال آیا کہ اس کو شائع کرایا جائے، لیکن چونکہ مَیں محض مالی وقت کے لحاظ سے شائع نہیں کر سکتا تھا، اس لیے مَیں نے مولانا شبلی مرحوم کے ایک نہایت ارادت مند فاضل دوست کو، جن کی ذرا سی توجہ اس کی اشاعت کی کفیل ہو سکتی تھی، لکھا: لیکن جناب موصوف نے بعض وجوہ سے ان خطوط کی اشاعت ہی مناسب تصور نہ فرمائی، اس لیے مَیں بھی کسی قدر متردّد ہو گیا اور دیگر دوستوں اور بزرگوں سے مشورہ لیا۔ ان میں سے بعض نے کسی قدر ترمیم کے ساتھ اور بعض نے علی حالہٖ شائع کرنے کی رائے دی اور خصوصاً مولوی عبدالحق صاحب نے تو اشاعت پر مجبوری کر دیا۔[۳]

شبلی کی کتابوں کو 'نونی' لگنے کی پیشین گوئی اور تنقید شعرالعجم کے ذریعے شبلی کے علمی وقار کو مسمار کرنے کے بعد ان کی شخصیت کے انہدام کا یہ بہترین موقع تھا، جسے مولوی عبدالحق کسی طور ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب کے خیال میں 'بڑا ظلم ہوگا، اگر یہ خط یونہی پڑے ردی میں مل جائیں اور تلف ہو جائیں اور دنیا اس نعمت سے محروم رہ جائے' اور

یہ کہ 'اگر یہ خط نہ چھپے تو اس کا الزام آپ [منشی محمد امین] کے سر رہے گا اور اردو زبان کی عدالت میں آپ سب سے بڑے مجرم سمجھے جائیں گے'۔[۵]

مولوی صاحب کے 'اصرار' پر امین زبیری نے یہ مجموعہ مکاتیب مرتب کر دیا اور مالی دشواریوں کے باوجود اپنے اشاعتی ادارے ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال سے شائع کر دیا، لیکن مولانا شبلی کے 'نہایت ارادت مند فاضل دوست' کے بارے میں ان کے دل میں گرہ بندھ گئی: حالانکہ اس موقع پر شبلی سے متعلق مکتوب الیہم اور مرتب کا رویہ بہت مثبت رہا، جس کا اظہار خطوطِ شبلی کے 'التماس وانتساب' سے ہوتا ہے۔ امین زبیری لکھتے ہیں:

(۱) غالباً اردو فارسی زبان میں ایسے خطوط کا یہ پہلا مجموعہ ہوگا کہ جو ایک علامۂ دوراں نے خواتین کے نام لکھے ہوں اور اس میں عورتوں کی مختلف خصوصیات کے متعلق ایسے گراں مایہ خیالات ہوں۔

(۲) ان بیگمات کے دل میں مولانائے مرحوم کی خاص عظمت ومحبت ہے۔ یہ خطوط ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں اور میں نے دیکھا کہ نہایت حفاظت کے ساتھ ان کی آہنی الماری میں رکھے ہوئے تھے اور ہزاروں اطمینان دلانے کے بعد مجھے اجازت دی گئی کہ میں بمبئی میں اپنے قیام گاہ پر ان کو نقل کروں۔

(۳) یہ دونوں بہنیں جس وقت مولانا کا تذکرہ کرتی ہیں اور ان کے واقعات سناتی ہیں تو ان کے لب ولہجہ اور الفاظ سے وہ احترام، وہ عظمت اور وہ محبت نمایاں ہوتی ہے، جس کا تعلق سننے اور دیکھنے ہی سے ہے۔[۶]

شبلی نعمانی کے لیے 'علامۂ دوراں' اور 'مولانائے مرحوم' کے القاب امین زبیری کے دل میں مکتوب نگار کے لیے احترام کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں: اسی طرح مکتوب الیہم علامہ کے خطوط کو 'ہر چیز سے عزیز' رکھتی ہیں اور علامہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے لب ولہجہ اور الفاظ سے احترام، عظمت اور محبت نمایاں ہوتی ہے: گویا اس مجموعے کی اشاعت تک مرتب یا مکتوب الیہم کے ہاں علامہ شبلی کے بارے میں کسی منفی جذبے یا خیال کا شائبہ نہیں ملتا۔

خطوطِ شبلی کی بنیاد پر اسماعیل یوسف کالج میگزین بمبئی (۱۹۴۳ء) میں نجیب اشرف ندوی

کا مضمون 'شبلی اور بمبئی'، تماہی ہندوستانی الٰہ آباد (اکتوبر ۱۹۳۶ء) میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کا مضمون 'مولانا شبلی بحیثیت شاعر' اور کتاب (اپریل ۱۹۴۵ء) میں وحید قریشی کا مضمون 'شبلی کی حیاتِ معاشقہ' شائع ہوا: جب کہ نومبر ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے 'شبلی کی شخصیت خطوں کے آئینے میں' کے نام سے سلطان حیدر جوش کی ایک گفتگو نشر ہوئی: البتہ شبلی کی شخصیت کے بارے میں مرتب خطوطِ شبلی کا پہلا منفی ردِ عمل حیاتِ شبلی کی اشاعت کے بعد ذکرِ شبلی کے نام سے ۱۹۴۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ نجیب اشرف ندوی، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی اور سلطان حیدر جوش وغیرہ کی تحریریں اور تقریریں گمنامی کی نذر ہو گئیں، لیکن وحید قریشی کے مقالے کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔

۱۹۴۳ء میں سید سلیمان ندوی کی مؤلفہ حیاتِ شبلی کا شائع ہونا تھا کہ شبلی کے خلاف ایک محاذ کھل گیا۔ مؤلف کی طرف سے علی گڑھ اور سرسید سے شبلی کے اختلافات کو نمایاں کرنے اور عطیہ فیضی کے نام شبلی کے خطوں کو نظر انداز کرنے سے حیاتِ شبلی متنازع ہو گئی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ علامہ شبلی اور حیاتِ شبلی میں امتیاز روا نہ رکھا گیا۔ مخالفت مؤلفِ حیات کی مقصود تھی، لیکن نشانہ شبلی بنے۔ اس سلسلے میں ایک سخت ردِ عمل ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر وحید قریشی کے مقالے 'شبلی کی حیاتِ معاشقہ' کی صورت میں سامنے آیا، جو انھوں نے حلقۂ اربابِ ذوق میں پڑھا۔ یہ مقالہ اسی برس رسالہ اپریل میں کتاب اور پھر مئی میں ادبی دنیا میں شائع ہوا۔ اس بحث میں عطیہ فیضی (ادبی دنیا، جولائی اگست ۱۹۴۶ء)، خالد حسن قادری (نگار)، علامہ نیاز فتح پوری (نگار)، منشی محمد امین زبیری (شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق ۱۹۴۶ء)، قاضی عبدالغفار (پیام، ۲۰ رجون ۱۹۴۶ء)، مولانا عبدالماجد دریابادی (الاصلاح)، مولوی احمد مکی (ہماری کتابیں، اگست ستمبر ۱۹۴۶ء)، عبدالرزاق ملیح آبادی (ماہِ ایام، دسمبر ۱۹۴۶ء) اور بمبئی کے بعض ہفتہ وار اخباروں نے حصہ لیا۔ ان مضامین وتاثرات کی روشنی میں، ترمیم و اضافے کے بعد وحید قریشی کا زیرِ بحث مقالہ ۱۹۵۰ء میں مکتبہ جدید لاہور کی طرف سے

کتابی صورت میں شائع ہوا۔

مولّفِ حیاتِ شبلی کو یہ دعویٰ نہیں تھا کہ 'یہ تالیف سوانح عمریوں کے صحیح اصول پر پوری منطبق ہے'، البتہ انھوں نے کی کوشش کی تھی کہ 'جو کچھ معلوم ہو، اس کو بے کم و کاست سپردِ قلم کر دیا جائے'، لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ:

> محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں، وہاں بدگمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے ان ہی پر پڑتی ہیں اور ان کے تکرار اور اعادہ میں ان کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں؛ لیکن یہ دونوں باتیں درحقیقت نفسیاتِ فطرت کے مطابق ہیں اور اس میں معتقد و منتقد دونوں معذور ہیں۔[۷]

حیاتِ شبلی اور شبلی کی حیاتِ معاشقہ انھی دونوں انتہاؤں کی عکاس ہیں۔ سید سلیمان ندوی، عطیہ کے نام شبلی کے خطوں کو سرے سے نظر انداز کر گئے تو وحید قریشی نے ان خطوں کے مندرجات کو اس انداز میں ترتیب دیا کہ من مانے نتائج برآمد کیے۔ اس بات کا اندازہ وحید قریشی کے درج ذیل جملے سے لگایا جا سکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> شبلی جیسے مذہبی خیالات کے آدمی کا عشق اور پھر وہ بھی بڑھاپے میں، مانی جانے والی بات نہیں۔ شبلی کے طرف داروں کے نزدیک تو ان باتوں کا ذکر ہی لاحاصل ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں کا تعلق شبلی کی ادبی زندگی سے مطلق نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف اسی ایک خیال نے شبلی کی شاعرانہ عظمت کو ہماری نظروں سے بہت حد تک اوجھل رکھا ہے۔[۸]

گویا فریقین اعتدال کی راہ اختیار کرنے کو تیار نہیں۔ شبلی کے بعض اشعار کی تعبیر کرتے ہوئے وحید قریشی اس انتہا کے بھی آخری سرے تک جا پہنچتے ہیں۔ ان کے نزدیک 'اگر مولانا کا عشق اوّل اوّل حجاب کی منزل میں تھا تو اس کے ساتھ ہی اس کا جنسی پہلو بھی ابتدا ہی سے نمایاں تھا'۔[۹] حالانکہ شیخ محمد اکرام کا خیال ہے:

> اس قسم کے اشعار کو شبلی کے لکھنوی مذاقِ شعر کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے کئی

> چشموں سے فیض حاصل کیا تھا اور اخیر میں عام طور پر ان کا مذاق بے حد سلجھ گیا تھا، لیکن ان کی ابتدائی ادبی تربیت اودھ پنچ اور پیامِ یار کے صفحات سے ہوئی تھی اور یہ اثر اخیر تک کچھ نہ کچھ قائم رہا، چنانچہ...... شبلی کی محبت کے جنسی یا غیر جنسی پہلوؤں پر رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔[۱۰]

بظاہر تو وحید قریشی نے شبلی کے عشق کے جنسی پہلو پر بحث کتاب کے ذیلی عنوان 'نفسیاتی مطالعہ' کی وجہ سے کی ہوگی، لیکن ان کے مقالے میں کسی ایک ماہرِ نفسیات کی رائے یا کسی ایک نفسیاتی اصول کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا۔ ان کے خیالات کی ساری عمارت محض قیاسات کی بنیادوں پر استوار ہے۔ حالات و واقعات کے بیان اور شبلی کی خطوط اور شاعری سے اقتباسات کے باوجود غالباً وحید قریشی کو قارئین پر اعتماد نہیں تھا، چنانچہ انھیں مجبوراً ان جملوں پر مقالے کو ختم کرنا پڑا کہ 'شبلی ناکام جیے اور ناکام مرے۔ یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ'۔[۱۱] جب کہ شیخ محمد اکرام سمجھتے ہیں کہ 'شبلی کے قلم کی ایک ایک سطر موجود ہے اور اردو ادب کا جزو بنتی جاتی ہے۔ شبلی کے خیالات آج بھی فضا میں گونج رہے ہیں اور قوم کے دل و دماغ پر ان کا سکہ برابر جاری ہے'۔[۱۲]

وحید قریشی کی ساری تحقیق اور نتائج کو ان کے ایک جملے کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں:

> بیگم صاحبہ جنجیرہ کے خاندان سے مولانا کے دوستانہ تعلقات قسطنطنیہ کے زمانے میں قائم ہوئے تھے، جو مئی ۱۸۹۲ء کا واقعہ ہے اور غالباً اُس وقت عطیہ ایک آدھ برس کی بچی تھی۔[۱۳]

حالانکہ عطیہ فیضی ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئی تھیں، یوں ۱۸۹۲ء میں ان کی عمر پندرہ برس ہونی چاہیے اور ۱۹۰۶ء میں مشیر حسین قدوائی کے ہاں انچاس سالہ شبلی سے ملاقات کے وقت انتیس برس؛ چنانچہ محقق کے اس 'غالباً' کا نتیجہ تحقیق یہی ہونا چاہیے تھا کہ 'شبلی جیسے مذہبی

خیالات کے آدمی کا عشق اور پھر وہ بھی بڑھاپے میں'۔

وحید قریشی کی یہ 'تحقیق' اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک 'چیزے دگر' کی حیثیت رکھتی تھی، چنانچہ اس کتاب کا چھپنا تھا کہ منشی محمد امین زبیری اور شیخ محمد اکرام بھی میدان میں اُتر آئے اور ادبی دنیا کے صلاح الدین کی دعوت پر عطیہ فیضی کو بھی اپنے تاثرات قلم بند کرنے کا موقع مل گیا[۱۴]۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا شمار اردو زبان و ادب کے لائق اساتذہ اور مستند ناقدین و محققین میں ہوتا ہے، یہی وجہ تھی کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد کسی موقع پر انھوں نے اپنے خیالات سے رجوع کر لیا، چنانچہ انھوں نے زیرِ بحث کتاب کو تلف کرنے کی شعوری کوشش کی؛ لیکن چونکہ تیر کمان سے نکل چکا تھا، اس لیے ایک بات یار لوگوں کے ہاتھ آ گئی اور صدیوں کے لیے گرمیِ محفل کا سامان ہو گیا۔

حال ہی میں عرفان احمد خاں نے وحید قریشی کی اس کتاب کو مرتب کر کے شائع کیا۔ 'عرضِ مرتب' میں ان کا کہنا ہے:

> اپنے وقتوں (۱۹۵۰ء) میں اس کتاب نے بڑا تہلکہ مچایا تھا، مگر علما کے شور مچانے پر کتاب کے مصنف نے اپنی تصنیف اور اس کے مندرجات سے دستبرداری کا 'سرِ اعلان' کر دیا، بلکہ مصنف نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے 'بااثر' ہو جانے پر خود اپنی ہی کتاب کو اُن تمام لائبریریوں سے 'غائب' کرا دیا، جو اُن کے یا اُن کے دوستوں کے حلقۂ اثر میں تھیں[۱۵]۔

ان بیانات سے یہ اندازہ نہیں ہو رہا کہ مرتب علما کے شور پر معترض ہیں یا 'بااثر' وحید قریشی کی شخصیت کو کمزور ثابت کرنا مقصود ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کو براہِ راست جاننے والی کتنی ہی علمی شخصیات، اللہ انھیں تادیر سلامت رکھے، ابھی موجود ہیں۔ ان کی رائے میں وحید قریشی مرحوم مضبوط اعصاب کے مالک تھے اور وہ کسی کے رعب و دبدبے میں آنے والے نہ تھے۔ کسی دباؤ میں آ جانا ان کی شخصیت پر الزام کے برابر ہے؛ البتہ ان کے فکری

ارتقا نے انھیں اپنے تنقیدی فیصلوں سے رجوع کرنے پر مجبور کیا ہو تو الگ بات ہے۔

....

سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی کے معاونین میں منشی محمد امین زبیری کو بھی شمار کیا گیا تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی کے ابتدائی مسودے اور اقبال احمد خاں سہیل کی مؤلفہ سیرتِ شبلی کے بعد ان کے فراہم کردہ لوازمے کو سب سے اہم قرار دیا اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ 'محبی منشی محمد امین صاحب زبیری علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے پرانے فائلوں سے بہت سی مفید تحریریں، نظمیں اور واقعات نقل کر کر کے بھیجتے رہے'[۱۶]۔

منشی امین زبیری کے لیے جو اندازِ تخاطب، یعنی 'محبی' شبلی نے تاحیات اختیار کیا، مؤلف حیاتِ شبلی نے اُسے برقرار رکھا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں امین زبیری کی محبت اور احترام کے قائل رہے۔ پھر حیاتِ شبلی میں ایسا کیا تھا کہ امین زبیری نہ صرف مؤلفِ حیات سے بے زار ہوئے، بلکہ اپنے ممدوح سے بھی متنفر ہو گئے اور ذکرِ شبلی کے نام سے ایک سخت تبصرہ لکھ ڈالا۔ یاد رہے کہ منشی محمد امین زبیری ۱۹۳۱ء میں بھوپال سے سبک دوش ہوئے اور علی گڑھ کو مستقر بنایا، دوسری جانب سید سلیمان ندوی درِ شبلی سے اُٹھے اور آستانۂ اشرفیہ پر جھک گئے۔ یوں دیوبند اور علی گڑھ کے مابین قدامت و جدت کی آویزش دو مصنفوں کے مابین تصادم کی صورت اختیار کر گئی۔ ذکرِ شبلی کے پس منظر میں یہی جذبہ کارفرما تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ 'یہ دراصل سرسید مرحوم کی عقیدت کا تقاضا بھی ہے اور ایک قومی خدمت بھی ہے کہ دنیا ایک عالم فاضل کے افترائیات اور اختراعیات [کذا] سے متاثر نہ ہو'[۱۷] گویا ایک جانب سرسید کا دفاع کیا جائے اور دوسری جانب سید سلیمان ندوی کے بعض بیانات کی حقیقت منکشف کی جائے۔

عجیب بات ہے کہ تیس بتیس برس گزرنے کے بعد بھی امین زبیری پر شبلی کی 'حقیقت' ظاہر نہ ہو سکی، حالانکہ وہ ۱۹۲۶ء میں خطوطِ شبلی بھی مرتب کر چکے تھے۔ حیاتِ شبلی پر ان کے ردِ عمل کو وقتی نہیں کہہ سکتے، بلکہ اس غیظ و غضب کی تپش ۱۹۵۲ء تک محسوس ہوتی رہی، جب

انھوں نے شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق (۴۱ صفحات) میں مزید رنگ بھرے اور اسے شبلی کی رنگین زندگی (۹۶ صفحات) کے نام سے شائع کیا۔ ذکر شبلی کے دیباچے میں امین زبیری نے حالات کے تغیر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> قیام علی گڑھ کے زمانہ میں میری علامہ سید سلیمان سے جو وقتاً فوقتاً ملاقات ہوئی، اس میں ان کی بعض باتوں سے محسوس ہوا کہ وہ علی گڑھ اور سرسید سے سخت تعصب، بلکہ نفرت رکھتے ہیں اور مسلم لیگ کی حقارت اور مسلم سیاست سے بیزاری ان کے دل کی گہرائیوں اور جسم کے ریشہ ریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔[۱۸]

امین زبیری کی اس بات کو محض تفنن طبع کا سامان نہیں سمجھا جا سکتا، اس میں کچھ حقائق بھی شامل ہیں۔ 'علی گڑھ اور سرسید سے سخت تعصب، بلکہ نفرت' تو دیوبند کا مطمح نظر تھا ہی، 'مسلم لیگ کی حقارت اور مسلم سیاست سے بیزاری' کا اظہار بھی دارالمصنفین کے مہمان خانے میں کانگریسی رہنماؤں کے بارہا قیام سے مل جاتا ہے۔ ان معاملات میں سید سلیمان ندوی کا رویہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، محمد امین زبیری کے جوابی حملے کا جواز فراہم نہیں ہوتا۔ انھیں ایک دکھ اس بات کا تھا کہ سید سلیمان ندوی نے خطوط شبلی شائع کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تھا، بلکہ 'بعض وجوہ سے ان خطوط کی اشاعت ہی مناسب تصور نہ فرمائی' اور دوسرا دکھ اس کا کہ ان کی خواہش کے باوجود علی گڑھ اور سرسید سے متعلق ابواب انھیں دکھائے نہیں گئے۔ افسوس کہ امین زبیری ناراض تو تھے سید سلیمان ندوی سے اور ان جرائم کی عبرت ناک سزا بھی انھیں کو دینا چاہتے ہوں گے، لیکن وہ یہ بھول گئے کہ ان کے اس عمل سے نقصان کس کا ہوگا، چنانچہ جنھیں وہ 'علامہ دوراں' اور 'مولانائے مرحوم' کے ناموں سے یاد فرماتے تھے، ان کے غیظ و غضب کا شکار ہو گئے۔ ذکر شبلی کی اشاعت اول کا معاملہ نہایت دلچسپ ہے، خود امین زبیری کی زبان سنیے:

> ۱۹۴۶ء میں ایک مکمل تنقید اڑھائی سو صفحے کی لکھی، جو کتب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اشاعت سے قبل ایک صاحب نے حق

> تالیف ادا کرنے کے معاہدے پر، جو مولوی عبدالحق کے ذریعے سے ہوا تھا اور بحق انجمن منتقل کر دیا گیا تھا، مسودہ لے لیا؛ مگر بعد کو حکیم اسرار احمد کریوی نے، جو انجمن کے سفیر خاص تھے، مولوی صاحب کی اجازت سے اس پر قبضہ کر لیا اور صرف چند نسخے شائع کیے اور بہ تعداد کثیر تلف کر دیے گئے۔ کیوں تلف کیے گئے، یہ راز حل نہ ہوا۔[۱۹]

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولوی عبدالحق بھی ہاتھ کھینچ گئے اور شبلی شکنی کے اس منصوبے میں سرپرست و معاون نہ بنے۔ 'صرف چند نسخے شائع' کرنے کا مقصد محض ماحول کو گرمانا ہو سکتا ہے، ورنہ وہ باقی نسخوں کو تلف نہ کرتے۔ حیرت ہے، امین زبیری پر یہ راز نہ کھل سکا۔

اس تلف شدہ کتاب کا کوئی نسخہ راقم کی دسترس میں نہ آ سکا، البتہ اس کا دوسرا اڈیشن پیش نظر ہے، جو مکتبہ جدید لاہور سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا اور جسے مرتب نے سابقہ مسودے کا خلاصہ قرار دیا ہے۔ یہ کتاب دراصل سید سلیمان ندوی کے بیانات کی تردید پر مشتمل ہے۔ اس کے بالاستیعاب مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ محمد امین زبیری تنقیص کے نام پر تنقیدی فریضہ انجام دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ابتدا میں مبصر نے شبلی کی عظمت سے متعلق دیباچہ حیات شبلی سے پانچ اقتباسات پیش کر کے بالترتیب سب کا مفصل جواب دیا۔ علی گڑھ کی زندگی کے بارے میں مؤلف حیات کے بیانات کی تردید کی، سرسید سے 'کشمکش اور اختلاف' اور اس سلسلے کی 'نوشعاعوں' پر تفصیلی بحث کی اور شبلی کی زندگی کے بعض واقعات سے ان کی شخصیت کو نشانہ تنقید بنایا۔ انداز تنقید ملاحظہ فرمایئے:

> بمبئی میں وہ ایک نہیں، کئی تیروں کے گھائل ہوئے تھے اور ایک پریشان بوالہوس کی طرح، اور اسی ہوس و پریشاں نظری میں ایک ممتاز و تعلیم یافتہ گھر کو برائے چندے مطمح نظر بنا لیتے ہیں اور خطوط میں اور شعر و سخن میں وہ جذبات و میلانات ظاہر کرتے ہیں، جو شبلی جیسے عالم و فاضل کے چہرہ پر نہیں کھلتے۔[۲۰]

۱۴۸ صفحات پر مشتمل اس تبصرے کا مرکزی خیال انھیں کے الفاظ میں یوں پیش کیا

جا سکتا ہے:

> مولانا شبلی کے اس احترام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، جس کے کہ وہ صحیح طور پر مستحق ہیں، اس امر کو بیان کرنے میں کوئی باک نہیں کہ وہ اپنے اور ابن خلدون کے قول کے مطابق، سیاست سے بعید ترین تھے اور انھوں نے سیاسیاتِ ہند کو مطلق نہیں سمجھا تھا۔ سرسید کی پالیسی پر بیدردانہ اعتراض ان کی سیاسی کوتاہ نظری کی بین دلیل ہے، جو پالیسی روز بروز صحیح سے صحیح تر ثابت ہوئی اور بالآخر پاکستان پر منتج ہوگئی۔[۲۲]

ذکرِ شبلی سے امین زبیری کا اطمینان نہ ہوا تو اسی برس (۱۹۴۶ء) خطوطِ شبلی کو بنیاد بنا کر شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق مرتب کر ڈالی۔ یہ محض اکتالیس صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ تھا، جسے بعد میں اضافہ و ترمیم کے ساتھ ۱۹۵۲ء میں شبلی کی رنگین زندگی کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس وقت یہی اڈیشن پیشِ نظر ہے، جسے جمیل نقوی نے مرتب کیا۔ مرتب نے درست لکھا ہے کہ شبلی کی رنگین زندگی کچھ ایسی رنگین نہ تھی، جسے پیش کرتے ہوئے تکلف محسوس ہو، اور یہ کہ 'اُن [عطیہ] کے ساتھ مولانا شبلی کو جو لگاؤ تھا، اس کی وجہ سوائے اس کے اَور کچھ نہیں کہ مولانا اپنے سابقہ خشک زاہدانہ ماحول سے نکل کر دفعتہً ایک زیادہ خوش گوار اور حیات افروز ماحول سے دوچار ہوئے، جس نے ان کے خوابیدہ جمالیاتی احساسات کو بیدار کردیا۔'[۲۳] خود زبیری صاحب مؤلف حیاتِ شبلی کے اس بیان کے پیچھے پناہ لیتے ہوئے کہ 'عشق و محبت کا جذبہ فطرتِ انسانی کا خمیر ہے'...... فرماتے ہیں کہ 'ہمارا فلسفۂ اخلاق تو عشقِ نفسانی کو بھی ایک فضیلت قرار دیتا ہے'، چنانچہ ان کے خیال میں 'اگر مولانا شبلی کے عشق و محبت کے افسانوں کو بیان کیا جائے تو ان کی علمی و قومی عظمت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا' اور 'یہ مختصر تبصرہ نہ تو شبلی کی تفضیح و تضحیک ہے اور نہ بد طینتی پر مبنی ہے، بلکہ تکملہ حیاتِ شبلی ہے۔'[۲۴]

اگرچہ منشی محمد امین زبیری نے اس تالیف کو حیاتِ شبلی کا تکملہ قرار دیا، لیکن ان کا انداز بہت جارحانہ تھا، چنانچہ انھوں نے ترتیبِ زمانی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے پسند کے

نتائج برآمد کیے۔ خطوطِ شبلی کے بارے میں یہ کہہ کر کہ 'ان میں کوئی بات اور کوئی چیز ایسی نہیں، جو اخلاقی ابتذال کہی جا سکے'، لکھتے ہیں کہ 'اس مجموعہ خطوط کی اشاعت کے بعد ہی مکاتیبِ شبلی کو بہت سے مکاتیب کے اضافوں کے ساتھ علامہ سید سلیمان نے ایک مقدمہ لکھ کر دو حصوں میں شائع کیا'[۲۵] حالانکہ مکاتیبِ شبلی کی جلد اوّل ۱۹۱۶ء اور جلد دوم ۱۹۱۷ء میں شائع ہو چکی تھی، جب کہ خطوطِ شبلی کی اشاعت ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ مہدی حسن افادی، ابوالکلام آزاد اور بعض تلامذہ کے نام خطوں کے مندرجات سے متعلق ان کے جملوں کی کاٹ ملاحظہ کیجیے:

> 'ان میں مولانا اتنے کھل کھیلے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے'۔
> 'ابوالکلام آزاد کے نام کے مکاتیب نے تو انھیں بالکل عریاں کر دیا ہے'۔
> 'مولانا شبلی علمی رفعت و بلندی سے اخلاقی ابتذال کی پست سطح پر آ جاتے ہیں'۔[۲۶]

شبلی سے متعلق منشی محمد امین زبیری کی رنجیدگی کے اسباب جاننے کے لیے زیرِ نظر کتاب میں حیاتِ شبلی پر ان کا درج ذیل تبصرہ بہت مفید ہو سکتا ہے۔ زبیری صاحب لکھتے ہیں:

> جب تنقیدی نظر سے ہم اس کتاب کو پڑھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ علامہ مرتب نے متذکرہ اصولِ سوانح نگاری سے دانستہ اعراض کیا ہے۔ بیشتر رطب و یابس روایات پر واقعات کے ہوائی قلعے بنائے اور دوسروں پر گولہ باری کی ہے۔ واقعات کی تخلیق، ان کا اخفا، حق و باطل کی تلبیس، مبالغہ، تمسخر، رکاکتِ بیان، علی گڑھ تحریک اور سرسید کی تنقیص و حقارت اور افترائیات کا ایک طومار ہے اور طرہ یہ ہے کہ خطوطِ شبلی کو، جو مکاتیبِ شبلی سے ایک علیحدہ مجموعہ ہے اور صرف دو بیگمات (عطیہ بیگم فیضی و زہرا بیگم فیضی) کے نام ہیں، قطعی نظر انداز کر دیا۔[۲۷]

خطوطِ شبلی کو نظر انداز کرنا اور علی گڑھ اور سرسید کی مخالفت بنیادی سبب قرار پاتے ہیں شبلی کی مخالفت کے۔ اس سلسلے میں زبیری صاحب کا ایک اَور بیان بھی قابلِ ذکر ہے۔ ۱۹۳۶ء۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی طرف سے مسلم عوام سے رابطہ کرنے اور مسلم لیگ کی قوت توڑنے کی مہم شروع ہوئی تو ابوالکلام آزاد نے بھرپور کردار ادا کیا۔ زبیری صاحب کے خیال

میں اگرچہ وہ ناکام رہے، تاہم ۱۹۴۰ء میں انھیں کانگریس کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ دارالمصنفین اوران کے رفقا سے قریبی تعلق کی بنا پر یہ اعزاز اس ادارے کے لیے باعث فخر تھا۔ زبیری صاحب لکھتے ہیں:

> اسی زمانے میں حیات شبلی مرتب ہو رہی تھی، اس میں اتحاد اسلامی اور کانگریس کی ہمرہی کو شبلی کا فیض صحبت تو دکھایا، مگر مسلم انڈیا کے اعتماد قطعی زائل ہونے اور ان [ابوالکلام آزاد] کو شو بوائے سمجھے جانے کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔[۲۸]

متذکرہ بالا تمام الزامات سید سلیمان ندوی پر عائد کیے گئے ہیں اور موجب سزا شبلی ٹھہرے، اس سے منشی محمد امین زبیری کی علمی دیانت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

شبلی کی حیات معاشقہ کے مصنف وحید قریشی، صلاح الدین صاحب کے بھی شکر یہ گزار ہیں، 'جو محترمہ عطیہ بیگم سے ایک ایسا مضمون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، جس کے بغیر یہ موضوع یقیناً تشنہ رہ جاتا'۔[۲۹] عطیہ فیضی کا یہ مضمون 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی' کے عنوان سے ادبی دنیا (جولائی اگست ۱۹۴۶ء) میں شائع ہوا۔ یاد رہے کہ ۱۹۲۲ء-۱۹۲۳ء میں عطیہ نے مدیر ظل السلطان کے مدیر محمد امین زبیری کو شبلی کے خطوط دکھائے اور انھیں رسالے میں اشاعت کی اجازت دے دی، بعدازاں یہ خطوط ایک مجموعے کی صورت میں شائع ہوئے، وہ لکھتی ہیں:

> اس واقعہ کو سالہا سال ہو گئے، مگر اب تھوڑا عرصہ ہوا، جب میرے علم میں آیا کہ اسی زمانے میں مولانا شبلی کے شاگرد اور جانشین سید سلیمان ندوی نے بھی ان کے خطوط کا ایک مجموعہ مکاتیب شبلی کے نام سے شائع کیا تھا اور اس میں بعض خطوط ایسے بھی شائع کیے، جن سے ہمارے نام کے خطوط کے ساتھ رابطہ اور سلسلہ ہے اور میری ذات اور شخصیت کے متعلق اشارے ہیں۔ ان سے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کو بھی ایک بڑا مواد اور مشغلہ ہاتھ آ گیا ہے۔ ریڈیو پر تقریر ہوئی اور اردو رسائل میں مضامین شائع کیے گئے، اگرچہ ہمارے خطوں میں تو کوئی بات ایسی نہ تھی۔[۳۰]

ان بیانات پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ مکاتیب شبلی ۱۹۱۶ء-۱۹۱۷ء میں شائع ہوتے ہیں، جن میں عطیہ کی 'ذات اور شخصیت کے متعلق اشارے' ہیں، لیکن حیات شبلی کی اشاعت تک عطیہ سے متعلق کسی ادیب یا افسانہ نگار کے ہاتھ نہ تو کوئی 'مواد' آتا ہے اور نہ کوئی 'مشغلہ'۔ عطیہ فیضی، شبلی کے خطوط کے جن مندرجات کو اپنی ذات اور شخصیت کے متعلق 'اشارے' قرار دیتی ہیں، اگر وہ اتنے ہی تشویش ناک ہوتے تو اس طویل عرصے (۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۶ء) میں ان کی بھنک عطیہ کے کانوں میں ضرور پڑتی۔ مکاتیب شبلی کے بارے میں عطیہ کا یہ کہنا بھی کافی دلچسپ ہے کہ 'ابھی [۱۹۴۶ء میں] تھوڑا عرصہ ہوا، جب میرے علم میں آیا'۔ دوسری جانب، اگر ان مکاتیب میں عطیہ کی ذات اور شخصیت کے متعلق 'اشارے' تھے تو اس کی جستجو عطیہ نے نہیں، محمد امین زبیری نے کی اور عطیہ نے بھی کمال مہربانی سے اپنے نام شبلی کے خطوط برائے اشاعت ان کے حوالے کر دیے۔ یہ خط پہلے ظل السلطان شائع ہوئے اور پھر کتابی صورت (خطوط شبلی) میں منظر عام پر آئے، لیکن حیرت ہے کہ ادبی دنیا میں اس پر بھی کوئی قابل ذکر ہلچل نہیں ہوتی؛ ورنہ تو یہی دو مواقع تھے، جب ادیبوں اور افسانہ نگاروں کے ہاتھ کوئی بات آ سکتی تھی، لیکن ان دونوں مواقع سے نہ کسی نے فائدہ اٹھایا اور نہ ہی اپنی شہرت کا سامان کیا۔ شبلی کے خط تو شائع ہو گئے، جن سے معلوم ہو گیا کہ ان میں کون کون سے 'اشارے' ہیں، لیکن عطیہ کے خطوط کے پردۂ اخفا میں چلے جانے کے بعد ان 'اشاروں' کا سبب معلوم نہ ہو سکا، چنانچہ ان کا یہ بیان تحقیق طلب رہ جاتا ہے کہ 'ہمارے خطوں میں تو کوئی بات ایسی نہ تھی'۔ عطیہ معترض ہیں:

> مولانا ایک شریف گھر میں ایک عالم، ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح جاتے ہیں۔ یہاں بڑی عزت سے ان کا استقبال ہوتا ہے، لیکن ان کے دل میں اور ہی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، جن کو ایسے راز دار دوستوں کے خطوں میں بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں، جو مہذب، تعلیم یافتہ اور عالم بھی ہیں

> اور یہ بزرگ ان خطوں کو اشاعت کے لیے نذر کر دیتے ہیں اور ان کے جانشین بھی، جو علم و اخلاق اور ادب کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتے ہیں، ان کو شائع کرتے ہیں اور یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس طرح وہ لائبل کے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ کیا اسی معیارِ شرافت پر ان عالموں اور فاضلوں کو ناز ہے؟[31]

اگر شبلی کے 'دل میں اَور ہی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں' جنھیں وہ 'راز دار دوستوں کے خطوں میں بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں' تو اس سے عطیہ بے خبر نہ تھیں، بلکہ شبلی انھیں بھی مطلع کرتے رہتے تھے۔ ۹ر جون ۱۹۰۹ء کے خط میں لکھتے ہیں، 'اب تو تمھارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سناتا ہوں اور لوگ سر دھنتے ہیں'۔[32] ۱۳ر اکتوبر ۱۹۱۰ء کو بتاتے ہیں، 'میرے خاندان کی عورتیں ...... تم سے بڑے شوق سے ملتیں، کیونکہ تمھارا اکثر تذکرہ میری زبان سے سنتی رہتی ہیں'[33] حتیٰ کہ ۱۵ر جولائی ۱۹۰۹ء کے ایک خط میں رقم طراز ہیں، 'میری لڑکی علاج کے لیے آئی ہے، وہ تمھارے خط پڑھ کر سخت حیرت زدہ ہوتی ہے کہ اس قابلیت کی بھی عورتیں ہوتی ہیں'۔[34] جن کے دل میں 'اَور ہی جذبات' ہوتے ہیں اور کسی کو 'مزے لے کر' سناتے ہیں تو وہ مکتوب الیہ کو نہیں بتاتے اور نہ ہی اس بات کا خاندان کی عورتوں یا بیٹی کے سامنے ذکر کرتے ہیں۔ عطیہ کا یہ بیان بھی توجہ طلب ہے:

> ہم نے مولانا کے خطوں کو، جو ہمارے نام آتے تھے، ہمیشہ معصومانہ روشنی میں دیکھا، کیونکہ ان میں بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی قسم کی بدگمانی کرتا یا کسی برائی کا احساس ہوتا، البتہ بعض نظموں میں شوخی ضرور ہوتی تھی، جو شاعرانہ طبیعت کا خاصہ ہے؛ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ راز و اشارات اُن ہی جذبات پر مبنی تھے اور بعض نظموں میں بھی ان کو شاعری کے پردے پر ظاہر کرتے تھے۔ انسان کے علم کا اندازہ تو ایک دن میں ہو جاتا ہے، لیکن نفس کی خباثت برسوں میں بھی نہیں معلوم ہوتی اور ہم بھی اسی علم و لاعلمی میں رہے۔[35]

عطیہ کے ان بیانات پر وحید قریشی نے نہایت دلچسپ نوٹ لکھا ہے:

> اس اقتباس میں دلائل سے زیادہ جذبات کا استعمال ہوا ہے اور مولانا شبلی کی

> ذات پر بعض نازیبا اور ناواجب حملے کیے گئے ہیں۔ شبلی جذباتی آدمی ضرور تھے، لیکن 'خبیث' نہیں۔ ...... متذکرہ بالا اقتباس میں لاعلمی پر جو ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے، ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور ہم علامہ شبلی اور علامہ اقبال کے ان جملوں کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں، جن میں عطیہ صاحبہ کو ذہین و فطین کہا گیا ہے۔[36]

واضح رہے کہ ۱۹۰۸ء میں دستۂ گل، ۱۹۰۹ء میں بوئے گل، ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں مکاتیبِ شبلی اور ۱۹۲۶ء میں خطوطِ شبلی کی اشاعتوں کے باوجود موضوعِ زیرِ بحث پر کسی طرف سے کوئی سوال نہیں اُٹھایا گیا، لیکن ۱۹۴۳ء میں حیاتِ شبلی شائع ہونے کے فوری بعد عطیہ سے متعلق گفتگو کا آغاز ہو گیا۔ اس بحث کا آغاز محمد امین زبیری سے ہوتا ہے، جن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عطیہ لکھتی ہیں کہ 'انھوں نے ہماری پوزیشن کو تبصرۂ حیاتِ شبلی میں بیان کر کے صاف کر دیا اور دنیا کو اصل حقیقت بتا دی'۔[37] کیا اندازِ تحسین ہے! یہ وہی امین زبیری ہیں، جنھیں نہ تو مکاتیبِ شبلی میں عطیہ کی ذات اور شخصیت کے متعلق 'اشاروں' سے کوئی اذیت پہنچی اور نہ ہی خطوطِ شبلی شائع کرتے ہوئے انھیں کچھ ملال ہوا، ملال ہوا تو اُس وقت جب حیاتِ شبلی منظرِ عام پر آئی۔

ابھی وحید قریشی کے 'خیالاتِ عالیہ' پر بحث جاری تھی کہ شیخ محمد اکرام کی شبلی نامہ منظرِ عام پر آ گئی۔ انھوں نے دس باب باندھے، جن میں سے چند ایک موضوعِ زیرِ بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے باب 'علی گڑھ' کے ابتدائی حصے میں علی گڑھ کالج میں آمد، سرسید سے شبلی کے تعلقات، کالج میں شبلی کے شب و روز، شبلی کی قدیم اور کالج کی جدید تعلیم کے ان پر اثرات اور کالج کی درس و تدریس سے تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکالنے جیسے معاملات پر سیر حاصل گفتگو کے بعد انھوں نے سید سلیمان ندوی کے بعض بیانات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے؛ یعنی 'سرسید اپنے ہم نشینوں سے آمنّا و صدقنا کے سوا کوئی اختلافِ رائے برداشت نہیں

کرتے تھے:[۳۸] 'سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر بات میں انگریز ہو جائیں'[۳۹]
یا 'اخیر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے'[۴۰] وغیرہ وغیرہ۔
شیخ اکرام لکھتے ہیں کہ انھوں [سلیمان ندوی] نے سرسید کی جو بھونڈی اور خلاف واقعہ تصویر
کھینچ کر بچارے شبلی کی مخالفت کا سامان کیا ہے، وہ شبلی کے دل و دماغ کی نہیں۔[۴۱]

سید سلیمان ندوی کے ان خیالات پر کہیں تو شیخ محمد اکرام نے وضاحتیں پیش کیں اور
کہیں کہیں طنزیہ انداز اختیار کیا۔ یہاں دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں، تا کہ شیخ
صاحب کے انداز اسلوب کو محسوس کیا جا سکے، لکھتے ہیں:

> سید سلیمان ندوی نے شبلی کے خطوط، مضامین، اشعار مرتب کیے ہیں۔ ان
> چیزوں کو مرتب کرتے ہوئے انھوں نے بہت سی قابلِ اعتراض باتوں پر سیاہی
> پھیر دی ہے، لیکن عقیدت مند آنکھوں کو قابلِ اعتراض باتیں مشکل سے ہی نظر
> آتی ہیں اور سید سلیمان ندوی کی احتسابی کارفرمائی کے بعد اب ان چیزوں کا یہ
> عالم ہے کہ آپ شبلی کی شخصیت کے خلاف کوئی فرد جرم مرتب کرنا چاہیں تو آپ
> کو شبلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تائیدی دستاویزات مل جائیں گی۔ اپنے استاد پر یہ
> احسان کر کے اور حیات شبلی میں بھی بعض ایسے رخنے چھوڑ کر، جن سے شبلی کی
> اصل شخصیت پر تھوڑی بہت نئی روشنی پڑ جاتی ہے، سید سلیمان اب اسے اپنے
> استاد کی خیر خواہی سمجھتے ہیں کہ ہر اس شخص کا منہ چڑائیں، جس کا قد و قامت شبلی
> سے بلند ہے۔[۴۲]
>
> شبلی کو سرسید سے لاکھ اختلاف سہی، لیکن سرسید کی نسبت ان کی وہ گری ہوئی
> رائے ہرگز نہ تھی، جو سید سلیمان کی ہے: جنھیں سرسید کو قریب سے دیکھنے کا کوئی
> موقع نہیں ملا، یا اُن لوگوں کی ہے، جو حقیقی واقعات سے بے خبر ہیں۔ آپ
> سرسید کے اس کارٹون کو دیکھیے، جو سید سلیمان نے حیات شبلی میں پیش کیا ہے
> اور اس کا شبلی کی اُس تصویر سے مقابلہ کیجیے، جو شبلی نے اُس وقت کھینچی تھی، جب وہ
> علانیہ سرسید کے خلاف صف آرا تھے۔[۴۳]

یہاں مصنف نے شبلی کے مضمون 'مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ' سے ایک اقتباس پیش

کیا ہے، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ شبلی تو آخر عمر تک سرسید کی عظمت اور بلندی کردار
کا ذکر برسرِ محفل کرتے رہے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ مضمون مسلم گزٹ لکھنؤ میں ۱۲ فروری ۱۹۱۲ء،
۴ مارچ ۱۹۱۲ء اور ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے شماروں میں شائع ہوا۔ یہی مضمون ماہ نامہ معارف
اعظم گڑھ کے شمارے جولائی ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا اور اب مقالات شبلی جلد ہشتم میں شامل
ہے۔ درج ذیل اقتباس یہیں سے نقل کیا جا رہا ہے۔ شبلی لکھتے ہیں:

> وہ پُرزور دست و قلم، جس نے اسباب بغاوت ہند لکھا تھا اور اُس وقت لکھا تھا،
> جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے۔ وہ بہادر، جس نے پنجاب
> یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اُڑا دی تھیں اور جو کچھ
> اُس نے ان تین آرٹیکلوں میں لکھا، کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس
> سے زیادہ پُرزور لٹریچر نہیں پیدا کر سکتا۔ وہ جاں باز، جو آگرہ کے دربار سے اس
> لیے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر
> درجہ پر نہ تھیں۔[۴۴]

شیخ محمد اکرام نے دوسری گرفت عطیہ فیضی کے حوالے سے ہے۔ ان کے خیال میں
'منتشر خطوط اور مبہم اشعار کی بنا پر کسی کی داستانِ دل مرتب کرنا آسان نہیں، لیکن جب
فریقین میں سے ایک شبلی کی سی قومی اہمیت رکھتا ہو اور دوسرا پرائیویٹ خطوط کو اشاعت کے لیے
حوالے کر دے تو پھر اس داستان کی ترتیب ناگزیر سی ہو جاتی ہے۔'[۴۵] شیخ اکرام خطوط شبلی،
شبلی کی حیات معاشقہ اور شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق کا ذکر کرتے ہوئے خطوط شبلی
اور غزلیات بمبئی کو ایک لڑی میں پرونے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں 'ان
تحریروں میں غلطی اور غلط فہمی کی گنجائش ہے'[۴۶] لیکن عطیہ کے مضمون 'مولانا شبلی اور خاندان
فیضی' نے اس مسئلے کو حل کر دیا۔ شیخ صاحب کی طرف سے عطیہ کے اس بیان کو کہ 'مولانا ایک
شریف گھر میں ایک عالم، ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح
جاتے ہیں، جہاں بڑی عزت سے ان کا استقبال ہوتا ہے، لیکن ان کے دل میں اور ہی

جذبات پیدا ہو جاتے ہیں[۴۸] بغیر کسی تامل و تردد کے درست مان لینے کا مشورہ ان کی جانب داری کا اظہار ہے۔ ان کا یہ خیال بھی ان کے تعصب کو ظاہر کرتا ہے کہ 'اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس آگ کو شعلہ زن رکھنے کی عطیہ بیگم صاحبہ نے کوئی بھی کوشش کی تھی'[۴۹] گویا وہ عطیہ کے خطوط کی عدم موجودگی میں محض قیاس پر بنیاد پر عطیہ کی معصومیت پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں اور شبلی کے 'زود اشتعال' جذبات کے بھڑک اٹھنے کی اطلاع بہم پہنچاتے ہیں۔

وحید قریشی نے عطیہ کی پیدائش کو ۱۸۹۲ء سے ڈیڑھ دو سال قبل کا واقعہ قرار دیا، جس کے مطابق عطیہ اور شبلی کی ملاقات کے وقت (۱۹۰۶ء میں) دونوں کی عمریں بالترتیب سولہ اور انچاس برس قرار پاتی ہیں، دوسری جانب شیخ محمد اکرام عطیہ کی عمر بیس سال سمجھتے ہیں، چنانچہ ان کے خیال میں 'مولانا کو اس قابل باکمال بست سالہ لڑکی نے جس طرح مسحور و بیخود بنا دیا تھا، اس کا اندازہ خطوط شبلی کے صفحے صفحے سے ہوتا ہے'[۵۰] حیرت ہے کہ ۱۹۷۱ء میں یادگار شبلی لکھتے وقت بھی وہ عطیہ (پ: ۱۸۷۷ء) کی عمر کا درست تعین نہ کر سکے اور اس میں یہی جملہ دہرا دیا، شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے 'شبلی اور عطیہ میں شاید تیس سال کا فرق' محسوس کیا[۵۱]

شیخ اکرام ایک طرف وحید قریشی کے بعض خیالات کی تردید کرتے ہیں تو دوسری جانب خود بھی قیاس آرائی سے کام لیتے ہوئے اپنی مرضی کے نتائج نکالتے ہیں:

> خطوط شبلی کے ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ دستہ گل کی بعض غزلیں اسی نشے کا اثر تھیں، جس نے خطوط شبلی کو ایک خم کدہ محبت بنا دیا ہے، لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ کون سی غزل کس لمحے کی یادگار ہے اور اس میں کس واقعے کی طرف اشارہ ہے، آسان نہیں۔ یہ تو ایسا کام ہے، جسے اگر 'عالم الاسرار' مولانا ابوالکلام آزاد (جو بمبئی کی بعض رنگین صحبتوں میں شبلی کے شریک تھے) چاہیں تو بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں اور دل دادگان شبلی کو ممنون کرم کر سکتے ہیں[۵۲]

اس اقتباس میں قیاس آرائی اور مزے لینے کی کیفیت دونوں پائی جاتی ہیں۔ یہ انداز تحقیق اصولوں کے سراسر منافی ہے۔ استخراج نتائج کے لیے قیاس آرائی، طنزیہ لب ولہجہ اور

لذت پسندی سود مند نہیں ہو سکتے۔ اس موقع پر وہ عطیہ فیضی، بیگم مہدی افادی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے خوب 'داد تحقیق' دیتے ہیں، لیکن اگلے ہی باب 'ندوۃ العلما لکھنؤ' کے پہلے پیراگراف میں شبلی کے ہاں معاملات کے توازن اور اعتدال کا اور جذباتی کیفیات پر قومی اور مذہبی فرائض کو ترجیح دینے کا اعتراف بھی کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

> بمبئی اور کلکتہ کی دلچسپیاں شبلی کے لیے بلا کی کشش رکھتی تھیں، لیکن ندوہ کی کشش اس سے زیادہ تھی۔ شبلی کو اگر عطیہ اور زہرا کی صحبت اور بمبئی اور کلکتہ کے خوش نما مناظر سے تعلق خاطر تھا تو اس مجموعۂ اضداد کو اپنی قوم اور مذہب اور اپنے علمی و ادبی مشغلے ان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ وہ بمبئی یا جزیرہ جاتے، تب بھی ان کا معمول تھا کہ اپنے عزیز اور حسین میزبانوں سے اُس وقت ملتے، جب صبح صبح اپنے وظیفہ علمی سے فارغ ہو جاتے، چنانچہ شبلی کی رنگین دلچسپیوں سے ان کے قومی کاموں میں کوئی فرق نہ آیا، بلکہ ان کی سب سے زیادہ قومی مصروفیت کے یہی دن تھے[۵۳]

جیسا کہ ایک وقت پر وحید قریشی نے اپنے نتائج تحقیق سے سرد مہری ظاہر کر دی، اسی طرح شیخ محمد اکرام نے شبلی نامہ کے دوسرے اڈیشن یادگار شبلی میں 'خطوط شبلی کی صحیح تعبیر' پیش کرتے ہوئے اپنے خیالات پر نظر ثانی کر لی۔ ذیل میں شیخ صاحب کے مذکورہ بیان سے منتخب حصے پیش کیے جاتے ہیں:

> عطیہ بیگم سے شبلی کو جو تعلق خاطر تھا، اگر یہ خیال کیا جائے کہ ان جذبات کی نوعیت ایک 'گناہ' کی تھی، جس کا 'ستر' چاہیے تو ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ ...... شبلی نے عطیہ کی نسبت اپنی رائے کو 'گناہ' نہیں سمجھا اور نہ ہی اس پر 'پردہ' ڈالنے کی بڑی کوشش کی۔ ...... عطیہ سے مراسم قدیم طرز کی ثقہ ہستیوں کو ناپسند ہوں گے، لیکن شبلی قدیم طرز کی ایک ثقہ ہستی نہ تھے، پھر ان میں 'گناہ' کے اصل مفہوم والی کوئی بات نہ تھی۔ ...... عطیہ بیگم سے شبلی نے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں، اس میں ان کی طبعی رومانیت کو بھی دخل تھا، لیکن یہ بھی انصاف نہیں کہ اس دل بستگی کے علمی اور اصلاحی پہلوؤں کا نظر انداز کر دیا جائے۔ ...... اس میں غیر

معمولی ذہانت اور قابلیت کی قدر، ہمت اور الوالعزمی کے لیے احترام، پولیٹکل خیالات سے اتفاقِ رائے، یہ سب باتیں شامل تھیں اور ان سب کے پس پشت یہ ارمان کہ ان کے ایک کرم فرما کی بیٹی، جس کے خاندان میں پردے کا رواج نہیں، ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرر بن جائیں، جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں اور اب جو وہ میدان میں آ چکیں، جو کچھ ہو، کمال کے درجہ پر ہو۔ شبلی اس جذبے کو گناہ نہیں سمجھتے تھے، سوائے معاندین یا خاص اہلِ احتساب کے، اس پر پردہ نہ ڈالتے تھے۔ ان کے دل میں کوئی چور نہ تھا۔[54]

....

علامہ شبلی کی رحلت کے بعد شبلی شکنی کی تمام تر ذمہ داری علی گڑھ کے تعلیم یافتہ مولوی عبدالحق نے سنبھال رکھی تھی، ان کے ساتھ ساتھ مولانا وحید الدین سلیم کی بھی بعض تحریریں شامل ہیں، جو سرسید کی زندگی کے آخری پانچ سالوں میں ان کے لٹریری سیکرٹری رہے؛ لیکن یہ بھی ہے کہ اس پورے دورانیے (۱۹۱۴-۱۹۴۳ء) میں مولوی صاحب کے 'ارشادات' کا نوٹس نہیں لیا گیا، لیکن حیاتِ شبلی کا منصۂ شہود پر آنا تھا کہ صرف ایک سال (۱۹۴۶ء) میں شبلی کی مخالفت میں چھوٹی بڑی تین کتابیں شائع ہو جاتی ہیں اور یہ سلسلہ ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۲ء اور ۱۹۷۱ء تک چلتا رہتا ہے۔

دیکھا جائے تو شبلی کی مخالفت میں خود شبلی کا قصور محض حیاتِ جاوید پر چند الفاظ پر مبنی تنقید ہے، اس کے علاوہ انھیں جن جرائم میں کٹہرے میں کھڑا کیا گیا، ان میں وہ خود مطلوب نہ تھے، بلکہ ان کو 'مجرم' ثابت کرنے میں ان کے ممدوح (سید سلیمان ندوی) کے قلم کی کرامات تھیں۔

عطیہ کے نام شبلی کے خطوط کی ۱۹۲۶ء میں اشاعت کے وقت اس کے مرتب نے شبلی پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور نہ ہی ان کا ذہن خطوط کے مندرجات سے شبلی کی کسی قلبی یا باطنی بُرائی کی طرف منتقل ہوا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس مجموعے کے منظرِ عام پر

آنے سے ۱۹۴۳ء تک کسی اَور کی نظر بھی ان 'برائیوں' پر نہیں پڑی؛ چنانچہ شبلی شکنی میں ان مراسلات کو بنیادی کردار نہیں سمجھا جا سکتا۔ یوں حیاتِ شبلی کی اشاعت ہی وہ سنگِ میل ہے، جہاں سے شبلی پر تنقیص کا آغاز ہوتا ہے؛ گویا سید سلیمان ندوی کی طرف سے علی گڑھ اور سرسید کے متعلق شبلی کے خیالات کی ترتیب ہی اصل وجہِ تنازع قرار پاتی ہے۔ سید سلیمان ندوی کو اس کشمکش کو ابھارنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ذیل میں اس کی چند وجوہ اور ان کا تجزیہ کرتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۱) مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاتھ پر سید سلیمان ندوی کی بیعت

(۲) علی گڑھ اور سرسید کو دیوبند کے نقطۂ نظر سے دیکھنا

(۳) علی گڑھ کا تحریکِ پاکستان اور اعظم گڑھ کا متحدہ قومیت کی طرف میلان

(۴) علی گڑھ اور سرسید سے شبلی کے اختلافات...... سید سلیمان ندوی کے بجائے اقبال احمد خاں سہیل کی اختراع

علامہ سید سلیمان ندوی کی زندگی میں، بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ۴۰ء میں ایک بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوا...... اپنی دینی عظمت و علمی جلالت کا لحاظ کیے بغیر حضرت مولانا (اشرف علی) تھانوی کے آستانہ پر جا کر اپنا سرِ نیاز جھکا دیا۔[55] اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا، مولانا محمد حنیف ندوی نے اس بیعت پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی سے کہا، 'آپ نے سیرت النبیؐ کو بہشتی زیور کے قدموں میں ڈال دیا ہے'۔ سید صاحب مسکراتے ہوئے بولے، 'آپ ہماری عمر کو پہنچیں گے تو آپ بھی یہی کریں گے'۔ مولانا حنیف ندوی نے برجستہ جواب دیا، 'میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ پر عمر کا اثر ہے'۔[56] اتفاق دیکھیے کہ اسی سال سید سلیمان ندوی صاحب کو سوانحِ شبلی لکھنے کا خیال آیا۔ حیاتِ شبلی کے دیباچے میں اس تالیف کی ابتدا کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ...... یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء آ گیا، یعنی مولانا کی وفات اور دارالمصنفین کی بنیاد پر پچیس چھبیس برس گزر گئے۔ احباب کا تقاضا ہوا کہ دارالمصنفین کی پچیس برس

> کی سلور جوبلی منائی جائے۔ میرا اصول یہ ہے کہ ـــ نمی رویم بہ رفعت کہ کارواں رفتست۔ اس پامال رسم کو چھوڑ کر یہ خیال آیا کہ اس جوبلی کی یادگار میں خود موضوع جوبلی، یعنی مولانا شبلی کی سوانح عمری کا وہ کام کیوں نہ انجام دے دیا جائے، جو سالہا سال سے فرصت کے انتظار میں پڑا ہے، چنانچہ بسم اللہ کر کے ۱۹۴۰ء میں اس کا آغاز کر دیا؛ آخر تین برس کی محنت میں ۱۹۴۳ء میں یہ انجام کو پہنچا۔[57]

گویا مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاتھ پر بیعت اور حیات شبلی کا آغاز ایک سال (۱۹۴۰ء) کے واقعات ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر ابراہیم ڈار نے شیخ محمد اکرام کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

> مولانا شبلی کی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ سید سلیمان صاحب نے ان کے سوانح حیات اُس وقت قلم بند کیے، جب وہ تھانوی عقیدت مندوں کے زمرے میں داخل ہو چکے تھے، اس لیے ان کی اطاعت و وفاداری شبلی اور اشرف علی کے درمیان بٹ گئی ہے۔[58]

شبلی کی ذات سے علامہ سید سلیمان کو جو نسبت تھی، اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ان کی سوانح عمری لکھتے اور اس محبت سے کہ اس پر اضافہ ممکن نہ رہتا۔ حقیقت بھی یہی کہ حیات شبلی پر ہر طرح کے اعتراضات کے باوجود بیاسی برس بعد بھی شبلی کی کوئی اَور سوانح عمری اس پائے کی نہ لکھی جا سکی؛ لیکن جو نسبت انھوں نے تھانوی صاحب سے قائم کی، اس کے تقاضوں کو بھی غالباً وہ نظر انداز نہ کر سکے اور شبلی کے علی گڑھ اور سرسید سے تعلقات کو دیو بند اور اشرف علی تھانوی کے نقطۂ نظر سے جانچنے لگے۔ یہ بات مفروضہ بھی ہو سکتی ہے، تاہم پروفیسر ابراہیم ڈار کا خیال ہے کہ 'مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد سید صاحب کے نقطۂ نظر میں ایک غیر معمولی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے'۔[59] البتہ شیخ محمد اکرام اس پس منظر کو تسلیم کرنے کے باوجود مختلف زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں:

> سید صاحب نے علامہ شبلی کے عقلی و اصلاحی کارناموں پر جو نسبتاً کم توجہ دی ہے،

> اس میں بھی ان کے نئے رجحانات کو دخل ہوگا، (جس سے اعظم گڑھ کے بھی کئی رفقا اختلاف رکھتے تھے) اور سرسید سے بڑھتے ہوئے بُعد میں بھی ان میلانات کا اثر ہوگا، لیکن ہمارا خیال ہے کہ سرسید کی نسبت سید سلیمان کے نئے نقطۂ نظر میں ملک کی بدلی ہوئی سیاسی فضا کو زیادہ دخل تھا۔[60]

شیخ محمد اکرام کے اس خیال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ شبلی کی رحلت کے بعد سے ۱۹۴۰ء تک برعظیم کی سیاسی فضا یکسر بدل چکی تھی۔ شبلی کی مطعون مسلم لیگ اب مسلمانانِ ہند کی ترجمان بن چکی تھی اور متحدہ قومیت کے علم بردار (علامہ محمد اقبال اور محمد علی جناح) تجربات کے بعد ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس بات کا ایک اَور پہلو بھی ہے اور وہ ہے سرسید کی کانگریس مخالف پالیسی کے نتیجے میں علی گڑھ کی تحریک پاکستان سے وابستگی اور دوسری جانب اعظم گڑھ کا کانگریس کی طرف جھکاؤ، جس کا واضح ثبوت دار المصنفین میں کانگریسی رہنماؤں کی مہمان نوازی سے ملتا ہے۔ معارف (سلیمان نمبر) سے ایک اقتباس دیکھیے:

> پنڈت موتی لال نہرو پوربی اضلاع کے دورے میں جب اعظم گڑھ آتے تو ہمیشہ دار المصنفین میں ہی ٹھہرتے۔ شبلی منزل ان کا بے تکلف مہمان خانہ تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی ہمیشہ یہی طریقہ رہا۔ وہ جب بھی اعظم گڑھ آئے، دار المصنفین میں ٹھہرے۔[61]

ایسے حالات میں جب یہ معلوم ہو رہا ہو کہ انگریز ہندوستان سے جا رہے ہیں اور جب یہ واضح ہونے لگے کہ آزادی کے بعد ہندوستان پر بلا شرکتِ غیرے کانگریس کی حکومت قائم ہو جائے گی؛ ایسے میں، شیخ محمد اکرام کے خیال میں، 'صرف ذاتی خیالات ہی کا نہیں، بلکہ ادارہ کی اور ایک حد تک قومی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ ادارہ کے مورثِ اعلیٰ کا سرسید سے زیادہ سے زیادہ بُعد ثابت کیا جائے'۔[62] صورتِ حال اور بیانِ واقعات کا یہ انداز علی گڑھ میں بیٹھے ہوئے شبلی کے 'محبی' کے لیے یقیناً ناقابلِ برداشت تھا۔

لیکن یہ بات اتنی سادہ نہیں کہ سرسید اور شبلی کے مابین مبینہ اختلافات کے اس پس منظر پر چپ سادھ لی جائے۔ شبلی کے سوانح و شخصیت کے متعلق سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، عبدالحلیم شرر، خواجہ غلام الثقلین اور حسرت موہانی کے متفرق مضامین کے بعد پہلی باضابطہ کوشش منشی محمد مہدی کا رسالہ تذکرۂ شمس العلما مولانا شبلی ہے، جو ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مولوی عبدالسلام ندوی نے مکاتیب شبلی وغیرہ کی مدد سے کچھ صفحات کا مسودہ تیار کیا، جسے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی اور شبلی کے بعض احباب و تلامذہ نے ملاحظہ کیا۔ سید سلیمان ندوی کے خیال میں، 'اس مجموعہ میں زندگی کی روح نظر نہ آئی' تو انھوں نے یہ کاغذات شبلی کی ایک اور شاگرد مولوی اقبال احمد سہیل کے سپرد کیے، جنھوں نے 'مولوی عبدالسلام صاحب کے مسودے کو گھٹا بڑھا کر اور علی گڑھ کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زورِ قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی'۔[۶۳] بقول سید سلیمان ندوی، یہ مضمون 'سیرتِ شبلی' کے عنوان سے الاصلاح سرائے میر میں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے چھ نمبروں میں مسلسل نکلتا رہا،[۶۴] جب کہ فاران کراچی (اپریل ۱۹۵۸ء) کے مطابق، 'سیرتِ شبلی' کا یہ سلسلہ پندرہ قسطوں تک پہنچ گیا تھا۔[۶۵] ۱۹۷۱ء میں یادگارِ شبلی کی اشاعت تک یہ اقساط منظرِ عام پر نہ آئی تھیں، البتہ شیخ محمد اکرام نے اس شک کا اظہار کر دیا تھا کہ 'سرسید اور شبلی کے اختلافات والا مضمون، جس کی وجہ سے حیاتِ شبلی کی اتنی مخالفت ہوئی، بنیادی طور پر سہیل صاحب نے لکھا اور اس کا بیشتر حصہ ان کے اندراجات پر مبنی ہے'۔[۶۶]

شیخ محمد اکرام کا یہ شبہ حقیقت کا روپ دھار چکا ہے، کیونکہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے ایک نوجوان اسکالر مولانا فضل الرحمٰن اصلاحی نے الاصلاح کے شماروں (اکتوبر ۱۹۳۶ء، نومبر تا دسمبر ۱۹۳۶ء، جنوری ۱۹۳۷ء، مارچ تا نومبر ۱۹۳۸ء اور جنوری تا فروری ۱۹۳۹ء) سے پندرہ اقساط کو شبلی صدی (نومبر ۲۰۱۴ء) کے موقع پر سیرتِ شبلی کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ ان کے مطابق، حیاتِ شبلی میں متعدد مقامات پر اس کے پورے کے

پورے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔[۶۷]

اس بیان کی تصدیق تو بعد میں کی جائے گی، پہلے اقبال احمد خاں سہیل کی مؤلفہ سیرتِ شبلی سے دو دلچسپ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

> ادھر جوں جوں مولانا کی غیر معمولی صلاحیتوں کے جوہر کھلتے جاتے، سرسید کی گرویدگی بڑھتی جاتی۔ ادھر اسٹیج کے اندر داخلہ کے بعد خود مولانا کی نگاہوں سے منظر کا رُعب کم ہوتا گیا، اسی طرح سید و شبلی روز بروز ایک دوسرے سے قریب ہو رہے تھے، مگر قرب کے ساتھ کشش اور کشش کے ساتھ کشمکش کا بڑھنا بھی قدرت کا عالم گیر اصول ہے۔ ادھر سرسید کو اپنی پختہ کاری اور جاذبیت پر اعتماد، ادھر علامہ شبلی کو اپنے علمی شرف اور تفوق کا احساس۔ ادھر سمعاً و طاعۃً سننے کے لیے حسنِ طلب کے سیکڑوں اسلوب، ادھر 'دع ما کدر' پر استقامت کے لیے حسنِ انکار کے ہزار پیرایے۔ ادھر نگاہِ سحر فن ایک جوہرِ قابل کو ہمہ تن جذب کر لینے کے لیے بے تاب، ادھر فطرتِ خوددار کو اپنی انفرادیت برقرار رکھنے پر اصرار۔[۶۸]

یہ پیراگراف سیرتِ شبلی کے اس حصے سے ہے، جہاں 'علی گڑھ میں مولانا کی خدمات' شروع ہونے میں چھ صفحات باقی ہیں؛ گویا واقعات کے بیان سے قبل ہی قاری کا ذہن تیار کیا جا رہا ہے، چنانچہ پچاس صفحات کے بعد جب 'علی گڑھ سے ترکِ تعلق' پر بات ہوتی ہے تو مؤلف کا درج ذیل بیان قاری کو خود بخود ان کے نقطۂ نظر کے قریب کر دیتا ہے:

> قیامِ تعلق کی طرح ترکِ تعلق کوئی اتفاقیہ واقعہ نہیں تھا، بلکہ مدتوں کی بددلی، کشمکش اور اصولی و شخصی اختلافات کا نتیجہ تھا، اس لیے کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے اور یہ تفصیل جن واقعات پر مبنی ہے، ان میں سے بعض ایسے نازک مسائل ہیں، جن کی تعبیریں محض زاویۂ نگاہ کے ذرا سے اختلاف سے بدل سکتی ہیں اور بعض ایسی تلخ حقیقتیں ہیں، جن کا اظہار، ممکن ہے کہ کسی شخص یا طبقہ کے خلاف مزاج ہو، اس لیے تقاضائے مصلحت تو یہی تھا کہ اس سارے یوسف زلیخا کو پیرے بود، پسرے دوست گم کرد باز یافت' کے اصول پر چند جملوں میں ختم کر دیا جائے، تا کہ دوست دشمن دونوں خوش رہیں، مگر انصاف بالائے اطاعت است ایک

سوانح نگار کو آفریں ونفریں سے بے نیاز ہو کر صرف واقعات کی اصلی اور مکمل تصویر پیش کرنی چاہیے۔ علاوہ بریں ان واقعات کے عینی شاہد ایک ایک کرکے اُٹھتے جا رہے ہیں، اس لیے اب وقت آ گیا ہے کہ اس علم سینہ کو درج سفینہ کر دیا جائے، تاکہ آئندہ نسلوں کو ماضی وحال کا ربط باہمی سمجھنے میں دُشواری نہ ہو۔[29]

ان دونوں اقتباسات سے علی گڑھ اور سرسید سے متعلق اقبال احمد خاں سہیل کے خیالات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اب یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ کیا سید سلیمان ندوی نقل کے مجرم ہیں یا سرسید اور شبلی کی کشمکش خود ان کی اختراع ہے؟ سیرت شبلی سے چند اقتباسات دیکھتے ہیں، تقابلی جائزے کے لیے حیات شبلی سے انھی واقعات کو پیش کیا جاتا ہے:

علی گڑھ کے رہنے والے ایک ہندو صاحب، جو کافی پڑھے لکھے اور صوفیانہ خیال کے آدمی تھے، اعظم گڑھ میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ انھوں نے سرسید کے مضمون 'الدعا والاستجابۃ' کی تردید میں ایک دل نشیں رسالہ شائع کیا، جس پر نواب وقار الملک بہادر نے نہایت عمدہ ریویو کیا اور اس ریویو کے سلسلہ میں اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ سرسید، جو نہ صرف خود مسلم اور جماعتِ اسلامی کے مسلّمہ لیڈر ہیں، بلکہ خانوادۂ رسالت کے چشم وچراغ بھی ہیں؛ وہ تو دعا کو، جو بندہ اور خدا میں ربط کا واحد ذریعہ ہے، غیر ضروری اور فضول بتائیں اور ایک ہندو، جس کو کافر کہا جاتا ہے، ایک اسلامی مسئلہ کی حمایت کرے۔ اس رسالہ کی قوتِ استدلال اور انداز بیان سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ دراصل مولانا شبلی اس کے مصنف ہیں۔ اس شبہ کو مزید تقویت اس امر سے پہنچی کہ مصنف اعظم گڑھ میں پوسٹ ماسٹر تھے اور مولانا شبلی کے خاص معتقد تھے۔[30]

علی گڑھ کے ایک ہندو بزرگ، جو اچھے پڑھے لکھے تھے، صوفیانہ خیال کے آدمی تھے، اعظم گڑھ میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ انھوں نے سرسید کے مضمون 'الدعا والاستجابۃ' کی تردید میں ایک دل نشیں رسالہ شائع کیا، جس پر نواب وقار الملک نے نہایت عمدہ ریویو لکھا اور اس ریویو کے سلسلہ میں اس پر افسوس کیا کہ سرسید، جو نہ صرف مسلمان اور مسلمانوں کے لیڈر ہیں، بلکہ خانوادۂ رسالت کے چشم وچراغ

ہیں؛ وہ تو دعا کو، بندہ اور خدا میں ربط کا واحد ذریعہ ہے، غیر ضروری اور فضول بتائیں اور ایک ہندو، جس کو کافر کہا جاتا ہے، اس کی حمایت کو کھڑا ہو۔ اس رسالہ کی قوتِ استدلال اور انداز بیان سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ اس کے مصنف دراصل شبلی ہیں اور اس شبہ کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اعظم گڑھ میں لکھا گیا، جو مولانا کا وطن تھا اور وہ پوسٹ ماسٹر صاحب مولانا کے واقفِ کار اور شناسا بھی تھے۔[31]

ایک اور اقتباس کا تقابل ملاحظہ کیجیے:

سرسید نے اپنی تفسیر کو عربی میں ترجمہ کرنا چاہا اور جب مولانا شبلی نے اپنی مصروفیتوں کی بنا پر عذر کیا تو مولانا حمید الدین فراہی پر نگاہ پڑی، جو اس وقت کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ترجمہ کا معاوضہ معقول تھا، یعنی ورق کے حساب سے پیش کیا جا رہا تھا، مگر مولانا حمید الدین نے انکار کر دیا اور جب سرسید نے بہ اصرار اس کی وجہ دریافت کی تو صاف کہہ دیا کہ وہ اشاعتِ باطل اور تعاون علی الاثم کی معصیت میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے۔ مولانا حمید الدین کی اس صاف گوئی سے علامہ شبلی کا کوئی تعلق نہیں تھا، مگر سرسید کی بدگمانی میں اس سے بھی اضافہ ہوا۔[32]

سرسید اپنی تفسیر کا عربی ترجمہ کرانا چاہتے تھے اور اس کے لیے ان کی نظر بار بار مولانا شبلی پر پڑتی تھی۔ مولانا سے جب اس کا ذکر آیا تو انھوں نے اپنی مصروفیتوں کا عذر کیا۔ اس کے بعد مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب فراہی پر نظر پڑی، جو اُس زمانہ میں عربی کی تکمیل کے بعد کالج میں پڑھتے تھے اور جنھوں نے سرسید کے حکم سے طبقات ابن سعد کے ایک حصہ کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، مگر مولانا حمید الدین صاحب نے انکار کیا اور جب سرسید نے بہ اصرار اس کی وجہ پوچھی تو صاف کہہ دیا کہ وہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون علی الاثم کے گناہ میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے۔ مولانا حمید الدین کی اس صاف گوئی میں گو مولانا شبلی کا کوئی تعلق نہ تھا، مگر سرسید کی بدگمانی میں اس سے اضافہ ہوا۔[33]

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ علی گڑھ اور سرسید کے متعلق شبلی کے مبینہ خیالات اور باہمی کشمکش کی تشہیر نے ہی تنقیصِ شبلی کو فروغ دیا اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ 'بزم میں رزم کا رنگ' بھرنے کا کام سید سلیمان ندوی نے نہیں، اقبال احمد خاں سہیل نے کیا تھا۔ یہ درست سہی کہ اقبال احمد خاں سہیل اس تنازعے کے موجد تھے، لیکن اکتوبر ۱۹۳۶ء سے فروری ۱۹۳۹ء تک الاصلاح میں چھپنے والی 'سیرتِ شبلی' کی چندرہ قسطوں سے ہندوستان بھر میں کتنوں نے اثر لیا، لیکن جب یہی بیانات سید سلیمان ندوی کی مؤلفہ حیاتِ شبلی میں شامل ہوئے تو ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ یقیناً اقبال احمد خاں سہیل علمی و ادبی اعتبار سے اُس مقام پر فائز نہ تھے کہ ان کی کسی تحریر سے دنیائے ادب میں ارتعاش پیدا ہوتا، اس لیے علی گڑھ یا سرسید کے حلقے سے ان کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا؛ جب کہ سید سلیمان ندوی اپنی شخصیت اور اپنے علمی و ادبی مقام و مرتبہ کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں مذہب، سیاست، تہذیب اور علم و ادب کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہو رہے تھے؛ اس لیے حیاتِ شبلی کے مندرجات سے وہ مد و جزر پیدا ہوا کہ اس کی لہریں ایک صدی بعد بھی محسوس کی جا سکتی ہیں۔

✿

١۔ ڈاکٹر خلیق انجم: شبلی کی حمایت میں؛ مشمولہ شبلی نعمانی معاندانہ تنقید کی روشنی میں مصنفہ سید شہاب الدین دسنوی، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۸۹ء، ص ۷
٢۔ مولوی عبدالحق: مقدمہ خطوطِ شبلی، بھوپال: محل السلطان بک ایجنسی، س ن، ص ۲۶
٣۔ سید سلیمان ندوی: مقدمہ مکاتیبِ شبلی اوّل، اعظم گڑھ: دار المصنفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ص ۱۲
٤۔ منشی محمد امین زبیری (مرتب): خطوطِ شبلی، بحولہ بالا ۲، ص ۳
٥۔ مولوی عبدالحق: مقدمہ خطوطِ شبلی، بحولہ بالا ۲، ص ۲۶
٦۔ منشی محمد امین زبیری (مرتب): خطوطِ شبلی، بحولہ بالا ۲، ص ۳-۴
٧۔ سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: دار المصنفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۰۸ء، ص ۶
٨۔ وحید قریشی: شبلی کی حیاتِ معاشقہ، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۰ء، ص ۱۷
٩۔ ایضاً، ص ۳۸
١٠۔ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، بمبئی: تاج آفس، ۱۹۳۶ء، ص ۱۵۱

١١۔ وحید قریشی: شبلی کی حیاتِ معاشقہ، بحولہ بالا ۸، ص ۸۰
١٢۔ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، بحولہ بالا ۱۰، ص ۲۷۲
١٣۔ وحید قریشی: شبلی کی حیاتِ معاشقہ، بحولہ بالا ۸، ص ۵۰
١٤۔ ایضاً، ص ۱۲
١٥۔ عرفان احمد خاں (مرتب): شبلی کی حیاتِ معاشقہ مصنفہ وحید قریشی، لاہور: ٹی اینڈ ٹی، طبع سوم ۲۰۱۳ء، ص ۱۶
١٦۔ سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، بحولہ بالا ۷، ص ۶
١٧۔ منشی محمد امین زبیری: ذکرِ شبلی، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء، ص ۹
١٨۔ ایضاً، ص ۶-۷
١٩۔ ایضاً، ص ۸
٢٠۔ ایضاً، ص ۸
٢١۔ ایضاً، ص ۱۳۳
٢٢۔ ایضاً، ص ۲۹
٢٣۔ جمیل نقوی (مرتب): شبلی کی رنگین زندگی مصنفہ منشی محمد امین زبیری، لاہور: فاروق عمر پبلشرز، ۱۹۵۲ء، ص ۶
٢٤۔ منشی محمد امین زبیری: شبلی کی رنگین زندگی مرتبہ جمیل نقوی، بحولہ بالا ۲۳، ص ۳۹
٢٥۔ ایضاً، ص ۱۰۹
٢٦۔ ایضاً، ص ۱۰
٢٧۔ ایضاً، ص ۳۱
٢٨۔ ایضاً، ص ۸۷-۸۸
٢٩۔ وحید قریشی: شبلی کی حیاتِ معاشقہ، بحولہ بالا ۸، ص ۱۲
٣٠۔ عطیہ فیضی: 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی'، بحوالہ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، بحولہ بالا ۱۰، ص ۲۷۳
٣١۔ ایضاً، ص ۲۷۴-۲۷۵
٣٢۔ شبلی نعمانی بنام عطیہ فیضی، مرقومہ ۹ر جون ۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، بحولہ بالا ۲، ص ۵۲
٣٣۔ شبلی نعمانی بنام عطیہ فیضی، مرقومہ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۱۰ء، خطوطِ شبلی، بحولہ بالا ۲، ص ۷۷
٣٤۔ شبلی نعمانی بنام عطیہ فیضی، مرقومہ ۱۵/ جولائی ۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، بحولہ بالا ۲، ص ۶۱
٣٥۔ عطیہ فیضی: 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی'، بحوالہ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، بحولہ بالا ۱۰، ص ۲۷۵
٣٦۔ وحید قریشی: شبلی کی حیاتِ معاشقہ، بحولہ بالا ۸، ص ۹۱، ۹۲
٣٧۔ عطیہ فیضی: 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی'، بحوالہ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، بحولہ بالا ۱۰، ص ۲۷۵

۳۸۔ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی بحوالہ بالا ۷، ص ۲۳۵
۳۹۔ ایضاً، ص ۲۳۱
۴۰۔ ایضاً، ص ۲۳۲
۴۱۔ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ بحوالہ بالا ۱۰، ص ۹۱
۴۲۔ ایضاً، ص ۹۰-۹۱
۴۳۔ ایضاً، ص ۹۱-۹۲
۴۴۔ شبلی نعمانی: مقالات شبلی جلد ہشتم مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۱۰، ص ۱۵۱
۴۵۔ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ بحوالہ بالا ۱۰، ص ۱۵۴، حاشیہ
۴۶۔ ایضاً
۴۷۔ عطیہ فیضی: 'مولانا شبلی اور خاندان فیضی'، بحوالہ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ بحوالہ بالا ۱۰، ص ۲۷۴-۲۷۵
۴۸۔ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ بحوالہ بالا ۱۰، ص ۱۵۵، حاشیہ
۴۹۔ ایضاً، ص ۱۵۴
۵۰۔ شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع دوم ۱۹۹۴، ص ۳۳۳
۵۱۔ ایضاً، ص ۳۳۱
۵۲۔ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ بحوالہ بالا ۱۰، ص ۱۶۴ ۔
۵۳۔ ایضاً، ص ۱۷۸
۵۴۔ شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی بحوالہ بالا ۵۳، ص ۳۳۳-۳۳۵
۵۵۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن: مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۱۹۸۸، ص ۴۳
۵۶۔ http://paighamstudios.blogspot.com/2011_03_01_archive.html
(بتاریخ ۱۵ اگست ۲۰۱۵، بوقت ۹ بجے صبح)
۵۷۔ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی بحوالہ بالا ۷، ص ۵
۵۸۔ پروفیسر ابراہیم ڈار بنام شیخ محمد اکرام، بحوالہ یادگار شبلی بحوالہ بالا ۵۳، ص ۸
۵۹۔ پروفیسر ابراہیم ڈار: مضامین ڈار، ص ۲۲۵، بحوالہ یادگار شبلی بحوالہ بالا ۵۳، ص ۸
۶۰۔ شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی بحوالہ بالا ۵۳، ص ۸
۶۱۔ معارف اعظم گڑھ، مئی جون ۱۹۵۵ء (سید سلیمان ندوی نمبر)، ص ۲۲، بحوالہ شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی بحوالہ بالا ۵۳، ص ۹

۶۲۔ شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی بحوالہ بالا ۵۳، ص ۹
۶۳۔ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی بحوالہ بالا ۷، ص ۵
۶۴۔ ایضاً
۶۵۔ فاران کراچی، اپریل ۱۹۵۸، ص ۲۸، بحوالہ شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی بحوالہ بالا ۵۳، ص ۱۰
۶۶۔ شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی بحوالہ بالا ۵۳، ص ۱۰-۱۱
۶۷۔ اقبال احمد خاں سہیل: سیرت شبلی مرتبہ فضل الرحمٰن اصلاحی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۳، ص ۵
۶۸۔ ایضاً، ص ۴۴
۶۹۔ ایضاً، ص ۱۰۱
۷۰۔ ایضاً، ص ۱۰۶
۷۱۔ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی بحوالہ بالا ۷، ص ۲۳۰
۷۲۔ اقبال احمد خاں سہیل: سیرت شبلی مرتبہ فضل الرحمٰن اصلاحی بحوالہ بالا ۱۷، ص ۱۰۶-۱۰۷
۷۳۔ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی بحوالہ بالا ۷، ص ۲۳۰

□□□

شبلی، اقبال اور عطیہ فیضی

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں شبلی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ سوانح عمری، علم کلام، تنقید، تحقیق، تاریخ، سفرنامہ، شاعری اور سیرت ان کے میدانِ تصنیف و تالیف رہے اور علی گڑھ، ندوۃ العلما، حیدرآباد، سرائے میر اور دار المصنفین ان کی علمی و ملی تگ و تاز کے میدان؛ پھر یہ بھی ہے کہ کتنے ہی شعبے ان کی اوّلیات سے سرفراز ہوئے۔ ایک شاعر، نثر نگار، فلسفی اور حکیم کی حیثیت سے اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) کا مقام و مرتبہ مسلّم ہے۔ شبلی اردو، فارسی اور عربی پر دسترس رکھتے تھے اور ترکی زبان سے بھی انھیں شناسائی تھی؛ جب کہ اقبال پنجابی، اردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر دسترس رکھتے تھے اور جرمن زبان سے بھی انھیں کچھ عرصہ تک لگاؤ رہا۔ جہاں تک عطیہ فیضی (۱۸۷۷ء-۱۹۶۷ء) کا تعلق ہے، وہ ترکی کے شہر استنبول میں پیدا ہوئیں، جہاں ان کے والد تجارت کی غرض سے مقیم تھے۔ عطیہ اپنے دَور میں ان چند مسلم خواتین میں سے تھیں، جنھوں نے یورپ میں تعلیم حاصل کی اور علوم و فنون کی تحصیل کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔

عطیہ فیضی سے شبلی کی پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی، جب عطیہ اور اس کی بہنیں (زہرا فیضی، نازلی رفیعہ سلطان) لکھنؤ کے دَورے میں شیخ مشیر حسین قدوائی کے ہاں قیام پذیر تھیں۔ اس ملاقات کے بعد شبلی کا بمبئی جانا ہوا تو خاندانِ فیضی نے اپنے کسی عزیز کی طرح ان کا استقبال کیا۔ عطیہ فیضی کا بیان ہے کہ دُوسرے سال (۱۹۰۷ء) ان کے پاؤں میں گولی

لگنے کے بعد وہ مصنوعی پاؤں کے انتظام کے لیے بمبئی آئے۔[۱] معلوم ہوتا ہے کہ عطیہ سے شبلی کی مشیر حسین قدوائی کے ہاں ملاقات غالباً ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔ اس کے بعد لکھنؤ، بمبئی اور بمبئی سے ایک سو پینسٹھ کلومیٹر دُور جنوب میں واقع ایک مسلم ریاست جنجیرہ (جو غالباً 'جزیرہ' کی بگڑی ہوئی شکل ہے) میں ان کی کئی ایک ملاقاتوں کی اطلاع عطیہ فیضی، زہرا فیضی (۱۸۶۶ء-۱۹۴۰ء) اور ایم مہدی حسن (مہدی افادی) کے نام متعدد خطوط سے ملتی ہے، البتہ آخری بار وہ جون ۱۹۱۴ء میں بمبئی گئے اور جولائی کی کسی تاریخ تک وہیں رہے۔ اس دَوران زہرا فیضی انھیں اپنے ہاں کھانے پر بلاتی رہیں، لیکن اس عرصے میں عطیہ سے ان کی ملاقات کی کوئی خبر نہیں ملتی۔

عطیہ سے اقبال کی پہلی ملاقات یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو لندن میں ہوئی، پھر لندن اور ہائیڈل برگ میں دعوتوں اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، جو ۴ ستمبر ۱۹۰۷ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد عطیہ کو ہندوستان لوٹنا پڑا، پھر جب عطیہ کو اپنی بہن نازلی رفیعہ سلطان (۱۸۷۴ء-۱۹۶۸ء) اور بہنوئی نواب سرسدی خان (۱۸۶۲ء-۱۹۲۲ء) کی معیت میں دوبارہ یورپ جانے کا اتفاق ہوا تو ۹ جون ۱۹۰۸ء کو اقبال ان سے ملنے کے لیے گئے۔ ہندوستان پلٹنے کے بعد کئی برس تک دونوں کی ملاقات نہ ہو سکی۔ عطیہ کی طرف سے جنجیرہ آنے کی دعوت کے جواب میں اقبال مسلسل معذرت کرتے رہے۔ یوں لگتا ہے کہ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۱ء کو مراسلت کا سلسلہ منقطع ہو گیا، جو دوبارہ تب بحال ہوا، جب دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے یورپ جاتے ہوئے اقبال بمبئی رُکے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء کو عطیہ نے ان کے اعزاز میں 'ایوانِ رفعت' میں ایک دعوت کا اہتمام کیا اور یورپ سے واپسی پر بھی ایسی ہی دعوت کی گئی۔ تیسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے اقبال ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو بمبئی پہنچے تو انھوں نے کچھ وقت عطیہ اور ان کے شوہر رحمین فیضی کے ساتھ گزارا۔[۲]

عطیہ کے نام شبلی کے خطوط کا دورانیہ ۱۷ فروری ۱۹۰۸ء سے ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء تک ہے

اور تقریباً سوا تین سال کے مختصر سے عرصے میں شبلی نے عطیہ کو پچپن خطوط تحریر کیے، جو تمام اردو زبان میں ہیں۔ عطیہ فیضی سے اقبال کی خط کتابت کا دورانیہ مارچ ۱۹۰۷ء سے ۲۹ رمئی ۱۹۳۳ء تک ہے؛ البتہ ۱۴ر دسمبر ۱۹۱۱ء سے آخری خط تک بائیس برس کا طویل وقفہ بھی ہے۔ یہاں عطیہ کا وہ بیان دہرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، جس کے مطابق 'بہت سے خطوط جواب دے دیے جانے کے بعد محفوظ نہ رہے، اس لیے کہ اُس وقت انھیں ان خطوں کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا'[۳]۔ عطیہ کے نام اقبال کے دستیاب خطوں کی تعداد گیارہ ہے، جو انگریزی زبان میں لکھے گئے۔ اس دوران شبلی کے صرف ایک خط (مرقومہ ۱۴ر اگست ۱۹۰۹ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال سے عطیہ کی مراسلت سے آگاہ تھے۔ شبلی نے لکھا تھا کہ 'تم نے میرے سوالوں کا تو جواب نہیں لکھا، میری اور مسٹر اقبال کی تعریف میں خط پورا کر دیا'[۴]۔

شبلی کے خطوں میں عطیہ سے تعلقات کے نشیب و فراز کے ساتھ القاب و آداب میں تبدیلی آتی رہی؛ یعنی 'عزیزی'، 'عزیزی عطیہ فیضی'، 'قرۃ عینی'، 'خاتونِ محترم'' خاتونِ محترم عطیہ فیضی سلمہا' اور 'مہد علیا' وغیرہ۔ وہ عام طور پر سلام و آداب کا التزام نہیں کرتے، تاہم چند ایک میں 'سلام علیکم'، 'سلامِ مسنون'، 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ'، 'حیاک اللہ' کے الفاظ ملتے ہیں۔ اقبال کے خطوں میں بھی باہمی تعلقات کی نوعیت کے ساتھ ساتھ القاب میں تغیرات آتے رہے، مثلاً...... 'مائی ڈیر مس فیضی'، 'مائی ڈیر مس عطیہ'، 'ڈیر مس فیضی' اور 'مائی ڈیر عطیہ بیگم' وغیرہ؛ جب کہ انگریزی زبان میں ہونے کے باعث یہ خطوط آداب و سلام سے بے نیاز ہیں۔

جہاں تک اختتامیوں کا تعلق ہے، شبلی نے چند خطوں میں 'والسلام' اور تین خطوں میں 'تمھارا خیر خواہ'، 'خدا حافظ' اور 'تمھارے کمالات پر حیرت زدہ' جیسے الفاظ درج کیے ہیں، جب کہ اقبال کے خطوں کا اختتامیہ بالعموم Yours sincerely یا Yours very

sincerely یا Yours ever sincerely سے ہوا ہے، البتہ ۱۳ر جنوری ۱۹۰۹ء اور ۳۰ر مارچ ۱۹۱۰ء کے خطوں میں Yours ever سے تعلقِ خاطر کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ایک مکتوب نگار اپنا نام 'شبلی'، 'شبلی نعمانی' یا 'نعمانی' لکھتا ہے تو دوسرا 'اقبال'، 'محمد اقبال' یا 'ایس ایم اقبال'۔

دونوں اکابر اپنی نظمیں اور تصانیف عطیہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ان پر اپنی رائے کا اظہار کرے۔ شبلی اپنی تصانیف اور بعض شعری تخلیقات عطیہ کو بھیجنے کے آرزو مند رہتے تھے۔ وہ مختلف مواقع پر عطیہ کو دیوان، سوانح مولانا روم، موازنۂ انیس و دبیر یا تہنیت کی غزل بھیجتے ہیں اور کبھی غزلوں کا مجموعہ یا شعر العجم کے مختلف حصے پیش کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔ کئی خط ان کی اپنی نظموں، غزلوں یا ان کے متفرق اشعار سے مزین ہیں، بعض خطوں میں موقع محل کی مناسبت سے انھوں نے اپنے اشعار کو جگہ دی ہے اور کبھی کبھار دوسروں کے اشعار بھی درج کیے ہیں۔ اقبال بھی اپنی نظم بھیج کر اس پر عطیہ کے تبصرے کے متمنی ہیں اور کبھی اپنی کتاب (فلسفۂ عجم) پیش کرنے کا عزم ظاہر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اقبال نے بعض خطوں میں اپنی اردو فارسی نظموں سے اقتباس اور موقع و محل کے مطابق اپنے اشعار بھی درج کیے ہیں۔ چند ایک مقامات پر اقبال نے اپنے اشعار کی تفہیم کے لیے اشعار کے ساتھ ان کا انگریزی میں ترجمہ بھی لکھ دیا، مثلاً ۷ر جولائی ۱۹۱۱ء کے خط سے اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

خندہ ہے بہر طلسم غنچہ تمہید شکست
تو تبسم سے مری کلیوں کو نامحرم سمجھ
درد کے پانی سے ہے سرسبزی کشت سخن
فطرت شاعر کے آئینے میں جوہر غم سمجھ

For the talisman of the bud, smile is the beginning of the end; regard my buds totally unaware of smile. The

field of poetry prospers through the water of suffering
the real essence of poet's nature is suffering. [5]

بمبئی آنے کی دعوت عطیہ نے شبلی کو دی تو انھوں نے قبول کر لی، اگر چہ شبلی متعدد مرتبہ جنجیرہ یا بمبئی میں عطیہ کے مہمان ہوئے، لیکن وہ اپنے قومی مقاصد کو کبھی نہیں بھولے: چنانچہ ۱۹۰۹ء میں بار بار کی دعوت کے باوجود شبلی بمبئی نہ جا سکے۔ غالباً عطیہ نے گلہ کیا، جس پر شبلی نے واضح کر دیا کہ 'دیر تک ملنے کی امید نہیں۔ میں وطن، احباب، آرام، سب چھوڑ سکتا ہوں، لیکن ایک مذہبی اور قومی کام کیونکر چھوڑ دوں، ورنہ بمبئی یا جزیرہ (جنجیرہ) دو قدم پر تھے'[6] ایک اور خط میں شبلی کو وضاحت کرنا پڑی کہ 'میری زندگی کے دو حصے ہیں، پرائیویٹ اور پبلک۔ اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا اندازہ کر سکتی'[7] اسی طرح اقبال کو بھی جنجیرہ آنے دعوت دی جاتی رہی، لیکن اقبال اپنی ذمہ داریوں کے پیش نظر ایک مرتبہ بھی نہ جا سکے۔ ۹ر اپریل ۱۹۰۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

I am sorry to hear that you do not believe me when I say that I wish to come to Bombay to see you and their Highnesses who were so very kind to me. I certainly do wish to come over, whether this would be possible, I cannot say at present. No greater relief to me than this.

[مجھے یہ معلوم کر کے نہایت افسوس ہوا کہ آپ کو باور نہیں آتا کہ میں آپ سے اور نواب صاحب اور بیگم صاحبہ سے، جو مجھ پر بے حد شفقت فرماتے ہیں، ملاقات کے لیے بمبئی آنے کا آرزومند ہوں۔ میں تو ضرور حاضر ہونا چاہتا ہوں، لیکن آیا یہ ممکن ہو سکے گا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یقین مانیے، آپ لوگوں کی صحبت سے زیادہ تسکین مجھے کہیں میسر نہیں۔][8]

عطیہ کے معاملے میں شبلی پورے اعتماد سے بات کرتے ہیں اور عطیہ پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ مولوی مشیر حسین قدوائی نے شبلی کو عطیہ کے اپنے ہاں آنے کی اطلاع دی تو شبلی نے واضح کر دیا کہ 'اگر آپ لکھنؤ آ کر کسی اور کی مہمان ہوں تو میں اس زمانے میں لکھنؤ چھوڑ کر

چلا جاؤں گا۔'[9] دوسری طرف، اقبال کسی پر اپنا حق نہیں سمجھتے اور نہ عطیہ کے حوالے سے کسی سے بات کرنا پسند کرتے ہیں، مثلاً ۱۷ر اپریل ۱۹۰۹ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ 'عبدالقادر صاحب سے اکثر چیف کورٹ کے کمرۂ وکلا میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ ایک عرصے سے آپ کے متعلق ہماری باہمی کوئی گفتگو نہیں ہوئی'[10] لیکن اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ 'میری کم گوئی اب بڑھتی جا رہی ہے۔'[11]

بعض مواقع پر عطیہ دونوں اکابر سے ناراضی کا اظہار کرتی ہیں۔ شبلی سے شکایت پیدا ہوئی تو ان کی بمبئی آمد اور قیام کے باوجود خاموشی اختیار کر لی اور اقبال سے ناراض ہوئیں تو لاہور میں انھیں اپنی آمد کی خبر تک نہ دی۔ شبلی و اقبال کے خطوں سے ایک ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

اس ستم ظریفی کو دیکھیے، مہینہ بھر بمبئی میں رہیں اور مطلق خبر نہ دی۔ خبر تھی کہ بیگم صاحبہ بھوپال کے ساتھ ولایت جا رہی ہیں، اس لیے زہرا کو لکھا، وہ بھی چپ رہیں۔ بہت پتا لگایا کہ بمبئی میں تم ہو تو آؤں، کچھ پتا نہیں چلا۔ ۶ر مئی کو زہرا صاحبہ کا خط آیا کہ سب لوگ جنجیرہ آ گئے ہیں۔ اب جا کر یہ خط آیا، سبحان اللہ۔ ...... افسوس! بمبئی میں بہت رہوں گا، لیکن تم سے ملنا محال ہو گیا، سمندر پار ہوئے[12]

His Highness was not mistaken in looking upon you as the only authority on my whereabouts. May I suggest that you did not choose to continue to be so; though I have confessed and shall always confess the power of this authority? Some people look upon me as a similar authority about you; but imagine my disappointment when I hear from other people that you had designed to visit Lahore and were already in it! And you did not condescend to drop a line to me! It was sheer chance that I had the pleasure to see you only to make myself more miserable.

[ہز ہائینس نے بجا طور پر میرے پتے کے متعلق آپ کو سند سمجھا اور یہ کیوں نہ

کیوں کر آپ نے ایسی سند ہونے سے انکار کر دیا۔ مَیں تو اس سند کے اختیارات تسلیم کرنے کو تیار ہوں اور ہمیشہ تیار رہوں گا۔ بعض لوگ ادھر بھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر آپ کے متعلق مجھے بھی ایسی ہی سند سمجھتے ہیں، لیکن میری مایوسی کا اندازہ کیجیے، جب مجھے دوسروں کی زبانی معلوم ہوا کہ لاہور آپ کے قدومِ میمنت لزوم سے مشرّف ہونے والا ہی نہیں، بلکہ ہو چکا ہے۔ آپ نے تو دو حرفی اطلاع تک سے دریغ فرمایا۔ آپ سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی اور اس سے میرے قلق میں مزید اضافہ ہوا۔[13]

شبلی روشن خیال بھی تھے اور جرأتِ رندانہ کے مالک بھی، لیکن قومی خدمت کے بعض امور میں وہ ذاتی آرزوؤں کو قربان کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ ندوہ میں بورڈنگ کی تعمیر کے لیے نصف اخراجات بیگم جنجیرہ (نازلی) نے قبول کیے تو عطیہ نے اس کا سنگِ بنیاد انھی کے ہاتھوں رکھنے کی تجویز پیش کی۔ اگرچہ شبلی متفق تھے، لیکن بعض مجبوریوں کے علاوہ انھیں 'عام مخالفت اور مولویوں کی برہمی' کا بھی خدشہ تھا۔[14] وہ واضح کرتے ہیں کہ مَیں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے۔[15] اس کے برعکس اقبال کو عوام کے احترام و عقیدت سے کوئی سروکار نہیں رہا اور نہ وہ کسی کے اختلاف یا مخالفت کے ڈر سے اپنی زندگی کی روش کو بدلنے پر تیار ہوئے۔ عطیہ نے شمالی ہندوستان میں اقبال کی ذات سے عقیدت و احترام کے فقدان پر افسوس کا اظہار کیا تو اقبال نے ایک خط میں انھیں بتایا:

> Let the many-headed monster of public give their dross of respect to others who act and live in accordance with their false ideals of religion and morality. I cannot stoop to respect their conventions which suppress the innate freedom of man's mind.

[عوام کے احترام و عقیدت کا خراج اُن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، جو عوام کے غلط نظریاتِ اخلاق و مذہب کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ مجھے عوام کے احترام کی خاطر اُن کے نظریات کو قبول کرکے اپنے آپ کو گرانا اور روحِ انسانی کی فطری آزادی کو دبانا نہیں آتا۔][16]

یہاں ایک بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، وہ یہ کہ عطیہ کے نام خطوں میں شبلی خود ہی ایک ارادے کا ذکر کرتے ہیں اور پھر خود ہی اس کے بارے میں عذر پیش کر دیتے ہیں۔ یورپ روانگی کے وقت شبلی عطیہ کو خدا حافظ کہنے بمبئی اس لیے نہ گئے کہ وہ خود کو کسی عزیز یا دوست کی رخصت کے وقت کا متحمل نہ پاتے تھے، لیکن ساتھ ہی یہ وعدہ کرتے ہیں کہ 'خدا کرے، جب واپس آؤ تو مَیں وہاں موجود ہوں، وہ البتہ مسرت بخش حالت ہو گی'۔[17] لیکن جب عطیہ وطن واپس پلٹتی ہے تو اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'میری زندگی کا یہ سخت افسوس ناک واقعہ ہے کہ یہ مبارک باد میرے لب کے بجائے زبانِ قلم ادا کرتی ہے'۔[18] عطیہ کے دوسرے دورۂ یورپ کے دوران شبلی نے زہرا فیضی کو لکھا کہ انھوں نے عطیہ کو بھیجنے کے لیے چکن کا ایک ہلکا سا رومال تیار کرایا ہے، جس پر عطیہ کا نام کاڑھا گیا تھا۔[19] لیکن اگلے ہی خط میں مطلع کیا کہ 'جو رومال مَیں نے تیار کرایا تھا، میرے موجود نہ ہونے سے دل خواہ نہ بنا، اس لیے اب لندن نہ بھیجوں گا۔ موقع ہوا تو بمبئی میں خود پیش کروں گا'۔[20] اکتوبر ۱۹۱۰ء میں عطیہ نے آگاہ کیا کہ ناگپور میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے آ رہی ہیں تو شبلی نے انھیں الٰہ آباد آنے کی دعوت دی، لیکن یہ بھی لکھ دیا کہ 'میرے خاندان کی عورتیں اُس وقت وہاں نہ ہوں گی'۔ یہ کہتے ہوئے کہ 'الٰہ آباد میں میرا چھوٹا بھائی اسحاق رہتا ہے، مَیں تو یہ چاہتا تھا کہ تم کو اُسی مکان میں اتاروں'، یہ بھی لکھ دیا کہ 'اطمینان نہیں کہ تمھاری مرضی کے موافق تم کو آرام مل سکے گا؟ دریا قطرہ میں نہیں سما سکتا'۔[21] ۲ نومبر کو لکھتے ہیں کہ 'مَیں دفعۃً بیمار ہو گیا اور اب تک ہوں اور معلوم نہیں، کب تک رہوں، اس لیے وہ سب تجویزیں درہم برہم ہو گئیں'۔ ساتھ ساتھ اسحاق کے مکان کے بارے میں کی گئی بات کو بھی یہ بتا کر ختم کر دیتے ہیں کہ 'میرے یہاں کی مستورات سب وطن چلی جائیں گی، کیونکہ برادرم اسحاق کا مکان اُس زمانے میں عام لنگر خانہ ہو جائے گا۔ ان کے سیکڑوں ملنے والے ہیں، سب انھیں

کے ہاں ڈھمی دیں گے'، اس پر افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ 'میں آپ کی مہمانی کا شرف کیونکر حاصل کروں گا'، لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ 'مکان اگر آپ کو مل سکتا ہے تو آپ سے زیادہ ہم لوگ ڈھونڈ سکتے ہیں، اس لیے آج ہی اسحاق کو لکھتا ہوں کہ وہ بھی تلاش کریں'۔[۲۲] ایک موقعے پر عطیہ کو لکھتے ہیں، 'میں چاہتا ہوں کہ میرے کسی کام میں تمھارے نام کی شرکت ہو اور اس کا اصلی طریقہ تو یہ تھا کہ کوئی تصنیف تمھارے نام پر ڈیڈیکیٹ کرتا'، لیکن اس خدشے کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ 'اس سے دفعتہً ان قومی کاموں کو نقصان پہنچے گا، جو میرے ہاتھ میں ہیں'۔[۲۳] پھر غالباً عطیہ نے تکرار کی، تب بھی وہ ٹال گئے اور لکھا کہ 'وہ وقت ضرور آئے گا، لیکن کب آئے گا، اس کا فیصلہ آج نہیں کرسکتا'۔[۲۴] اس طرح شبلی نے کمال دانش مندی سے، انکار کیے بغیر، اس خواہش کو غیر معینہ مدت تک کے لیے مؤخر کردیا اور پھر کبھی اس کا موقع نہیں آیا۔ اقبال بھی ایک خط میں اپنے مجموعۂ نظم کو 'ایک ہندوستانی خاتون' کے نام معنون ہونے کی خبر دیتے ہیں۔[۲۵] یہ بات انھوں نے کسی وقتی جذبے کے تحت کہی تھی یا اس معاملے میں وہ واقعی سنجیدہ تھے؛ یہ تو معلوم نہیں، لیکن انھوں نے نہ صرف مذکورہ شعری مجموعے [؟]، بلکہ بعد میں بھی کسی کتاب کا انتساب عطیہ کے نام نہیں کیا۔

شبلی کے ہاں عطیہ کے بارے میں دو رویے ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ وہ محبت و احترام کا اظہار کرتے ہیں، لیکن اس دوران اپنے مقام و مرتبے کو کبھی نہیں بھولتے۔ ایک خط میں فنِ موسیقی سے ان کی واقفیت کے پیشِ نظر اس امر کی اجازت طلب کرتے ہیں کہ 'لوگ تم کو پوجیں' اور اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ 'و انا اوّل العابدین'۔[۲۶] لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ عطیہ کی ہر بات پر آمنا وصدقنا نہیں کہتے، بلکہ بعض اوقات سخت لہجہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ 'آپ بھی عجیب باتیں کہتی ہیں۔ یہاں سب لوگ کہتے ہیں کہ ڈاک جنجیرہ کی بند ہو جاتی ہے اور کئی مہینے تک بند رہتی ہے اور آپ فرماتی ہیں کہ جنجیرہ آؤ اور جب چاہو، واپس جاؤ'۔[۲۷] ایک اور موقعے پر، جب عطیہ علی گڑھ کالج اور

جنجیرہ کے بارے میں شبلی کے چند جملوں سے خفا ہوئیں، شبلی نے لکھا:

> آپ کا غضب آلود خط ملا۔ افسوس ہے کہ آپ نے اس کو اور نگاہ سے دیکھا۔ علی گڑھ کی تحقیر ہرگز مقصود نہ تھی —— جزیرہ [جنجیرہ] کا چھوٹا ہونا بھی مجھے معلوم نہ تھا، نہ میں نے وہاں کے داخل و خارج کا کبھی تجسس کیا —— بہر حال، اگر کوئی غلطی ہوئی تو وہ بدنیتی سے نہیں ہوئی۔ آپ کا اس قدر برہم ہونا میرے لیے موجب افسوس و رنج ہے —— امید ہے کہ آپ خط دیکھنے کے بعد غیض [غیظ؟] و غضب کو دور فرمایئے گا۔[۲۸]

یہاں شبلی نے اپنے لکھے پر معذرت نہیں کی، بس افسوس کا اظہار کر کے بات ختم کردی۔ تقریباً سوا سال تک کسی خط میں اس بات کو دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ عطیہ کے نام شبلی نے اپنے دوسرے ہی خط میں واضح کردیا تھا کہ 'آپ' کے بجائے 'تم' کا لفظ لکھوں گا۔ اگرچہ اس کی وجہ انھوں نے 'آپ' کے لفظ میں بیگانہ پن کو قرار دیا،[۲۹] لیکن اسے بھی احساسِ عظمت کا اظہار سمجھنا چاہیے، البتہ اقبال کا انداز ذرا مختلف ہے۔ عطیہ کے نام خطوں میں ان کے ہاں خود سپردگی کا احساس ہوتا ہے۔ عطیہ نے شکایت کی کہ وہ اس کی خواہشات کے عدمِ احترام کے مرتکب ہوئے ہیں اور یہ کہ 'آپ کو زیادہ محتاط ہونا چاہیے'۔ اقبال وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> This is indeed strange; for I always make it a point to obey your wishes and to please you in any way I can. — Please explain to me in what respect I should be more careful. I am ready to do all that will please you. The world cannot worship me. I would not be worshipped, since my nature is such that I cannot become an object of worship, so deeply is ingrained in me the instinct of a worshipped.
>
> [یہ بڑے تعجب کی بات ہے، کیوں کہ آپ کی خواہشات کا احترام میں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے اور آپ کی خوش نودی کے لیے امکان بھر کوشاں رہا ہوں ——

> ازراہِ کرم ذرا وضاحت فرمایئے، مجھے کس اعتبار سے زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ میں ہمہ تن آپ کی خدمت کے لیے آمادہ ہوں۔ میں تو اپنی فطرت کے تقاضے سے پرستاری پر مجبور ہوں، میری پرستش کوئی کیا کرے گا۔][۳۰]

اقبال ان تعلقات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ 'وضاحتوں' اور 'صفائیوں' سے کام لیتے ہیں، مگر کسی وقتی جذبے کے پیش نظر پسپائی اختیار نہیں کرتے، چنانچہ فوراً سنبھل جاتے ہیں اور اگلے ہی جملے میں لکھتے ہیں:

> But if the innermost thoughts of my soul are ever revealed to the public, if what lies covered in my heart is ever expressed, then, I am sure, the world will worship me some day after my death. The will forget my sins, and give me the tribute of a tear.
>
> [لیکن وہ خیالات، جو میری روح کی گہرائیوں میں ایک طوفان بپا کیے ہوئے ہیں، عوام پر ظاہر ہوں تو پھر مجھے یقین واثق ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہوگی۔ دنیا میرے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گی اور مجھے اپنے آنسوؤں کا خراجِ عقیدت پیش کرے گی۔][۳۱]

یہاں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷راپریل ۱۹۰۹ء، ۱۷رجولائی ۱۹۰۹ء، ۳۰رمارچ ۱۹۱۰ء اور ۷راپریل ۱۹۱۰ء کے خطوط میں اقبال شکایات کی وضاحت اور عطیہ کی ناراضی دُور کرنے میں کوشاں رہے۔ اس ایک سال میں یہی چار خط اقبال نے لکھے اور چاروں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اقبال عطیہ کی غلط فہمی کو دُور کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتے رہے، لیکن عطیہ تھیں کہ ماننے کو نہیں آتی تھیں۔ اس کے بعد اقبال خاموش ہو گئے اور پھر جب ۷رجولائی ۱۹۱۱ء کو خط کتابت کا سلسلہ بحال ہوا تو اقبال فکر و نظر کی اگلی منزلوں کی طرف گامزن ہو چکے تھے۔

اقبال عطیہ کو رازداں بناتے ہیں تو اس امید پر کہ وہ ان کی تشہیر نہیں کریں گی، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ 'یہ صیغۂ راز کی باتیں ہیں، براہِ کرم کسی سے ان کا ذکر نہ کریں'۔[۳۲] اسی طرح عطیہ کو

یقین دلاتے ہیں کہ 'آپ کے خطوط کو میں ہمیشہ ایک محفوظ صندوق میں رکھتا ہوں، انھیں کوئی نہیں دیکھ سکتا'۔[۳۳] جب کہ شبلی عطیہ کو نہ تو کوئی نصیحت کرتے ہیں اور نہ خود ان تعلقات کو رازداری میں رکھتے ہیں، البتہ عطیہ ان کے خطوط کو نہایت حفاظت سے رکھتی رہیں، جس کی شہادت منشی محمد امین زبیری نے اپنے مرتبہ خطوطِ شبلی میں 'التماس و انتساب' میں دی۔ انھوں نے لکھا:

> یہ خطوط ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں اور میں نے دیکھا کہ نہایت حفاظت کے ساتھ ان کی آہنی الماری میں رکھے ہوئے تھے اور ہزاروں اطمینان دلانے کے بعد مجھے اجازت دی گئی کہ میں بمبئی میں اپنے قیام گاہ پر ان کو نقل کروں۔[۳۴]

شبلی، عطیہ سے اپنے تعلقات اور ان سے مراسلت کو مخفی نہیں رکھتے۔ وہ ان خطوں کو بڑے فخر سے اپنے عزیزوں کو دکھاتے اور پھر اس کی خبر عطیہ کو بھی دیتے۔ عطیہ بھی جانتی تھیں کہ شبلی کے بعض قریبی اعزہ و احباب اس خط کتابت سے آگاہ تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ عطیہ کے نام خطوں کے بارے میں ان کی بہن زہرا فیضی اور زہرا کے نام مراسلت سے عطیہ فیضی مطلع تھیں، چنانچہ اس مراسلت کو خفیہ نہیں کہا جا سکتا۔ عطیہ کو بتاتے ہیں کہ 'اب تو تمھارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سناتا ہوں اور لوگ سر دُھنتے ہیں'،[۳۵] 'میری لڑکی [فاطمہ] علاج کے لیے آئی ہے، وہ تمھارے خط پڑھ کے سخت حیرت زدہ ہوتی ہے کہ اس قابلیت کی بھی عورتیں ہوتی ہیں'[۳۶] اور 'کانفرنس تو ناگپور ہی میں ہوگی، لیکن تم ضرور الٰہ آباد آؤ۔ افسوس ہے کہ میرے خاندان کی عورتیں اس وقت وہاں نہ ہوں گی، ورنہ تم سے بڑے شوق سے ملتیں، کیونکہ تمھارا اکثر تذکرہ میری زبان سے سنتی رہتی ہیں'۔[۳۷] اس کے برعکس جب دوسروں کو بتاتے ہیں تو اندازِ بیان ذرا بدل جاتا ہے۔ ۷راکتوبر ۱۹۰۸ء کے خط میں عطیہ کو لکھتے کہ 'ایک بے ریا دل، ایک مخلص دل، وفا شعار دل کی طرف سے سفر سے مراجعت کی مبارک باد قبول کرو۔ میری زندگی کا یہ سخت افسوس ناک واقعہ ہے کہ یہ مبارک باد میرے لب کے بجائے زبانِ قلم ادا کرتی ہے۔۔۔۔۔۔ تہنیت کی غزل الگ مرسل ہے'۔[۳۸]

اسی واقعے کا ذکر مہدی حسن سے کرتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ 'حال میں خیر مقدم لکھا۔ ۹ راکتوبر کو [عطیہ] لوگ بمبئی آ گئے، لیکن خیر مقدم میں جہاں جہاں اصلی رنگ اُبھرا تھا، ان پر سیاہی بھر دی۔'[39] ۷ رنومبر ۱۹۰۸ء کو عطیہ کو لکھا کہ 'کل اتفاق سے مولوی مشیر حسین صاحب قدوائی ملنے آ گئے تھے، ان سے آپ کے لکھنؤ آنے کا ذکر آ گیا۔'[40] اس کے بعد مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

> بمبئی کا مہمان آج کل حسنِ اتفاق سے یہیں ہے۔ یہ لفظ، یعنی اس کا پہلا جزو کبھی اس سے عمدہ تر موقعے پر استعمال نہیں ہوا ہوگا؛ لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ ندوہ کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے مواقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ وقت، نہ دماغ؛ حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔ ان صحبتوں میں اس کی قابلیتوں کے حیرت انگیز پہلو نظر سے گزر رہے ہیں۔ اردو، فارسی، انگریزی، فرنچ، زبان دانی، مصوری، نقشہ کشی، پالیٹکس، قوتِ تحریر، ع...... آنچہ عالم ہمہ می داشت تو تنہا داری...... افسوس غیرت اور محبت کی کشاکش تھی، ورنہ آپ بھی وہ دیکھتے، جو میں کہتا ہوں۔[41]

پھر جب عطیہ لکھنؤ سے روانہ ہو گئیں تو مہدی حسن کو گزرے دنوں کی خوش گوار یادوں کے پس منظر میں ۱۲ ردسمبر ۱۹۰۸ء کو لکھتے ہیں:

> مجھی! ندوہ کے بدمزہ اشغال نے دل اور آنکھوں کو اپنا کام کب کرنے دیا کہ کچھ دیکھتا دکھاتا۔ اب تک وہ خمار نہیں اُترا؛ سو سو طرح چاہتا ہوں کہ اس دام سے دو دن کے لیے چھوٹ سکوں، لیکن اَور زیادہ الجھ جاتا ہوں۔ ٹرکی کے ارتقائی حالات کی نسبت 'سلطانِ جمال' کی رائے بالکل عام دنیا کے مخالف ہے۔ یہاں بھی یکتائی کی شان ہے۔ ان کا خیال، بلکہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ٹرکی ایک یورپین طاقت کا بازیچہ ہے اور یہ پتلیاں صرف بیرونی تاروں پر حرکت کرتی ہیں۔ جدید قرض نے اپنا جان ستانی کا کام انجام دیا ہے اور دیتا جاتا ہے؛ لیکن باوجود 'معبودیت' کے، اس مسئلے میں میں اب تک 'صاحبِ ایمان' نہیں۔ یہ ضرور نہیں کہ 'سیاست' اور 'حسن' کا ایک ہی فرماں روا ہو۔[42]

لیکن ہر مکتوب الیہ ہم راز نہیں۔ دیگر مکتوب الیہم کو اگر کبھی کچھ بتاتے ہیں تو عطیہ کے کمالات

سے متعلق ہی بتاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سرفراز کے نام ایک خط میں عطیہ لوگوں کی اردو زبان پر دسترس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ دو اقتباسات دیکھیے:

> اس اثنا میں زہرا اور عطیہ فیضی کے بہت سے خطوط آئے اور بعض میں علمی مضامین بھی تھے۔ ان ظالموں کی اردو نویسی پر مجھ کو تعجب ہوتا ہے۔ آپ کو شاید کبھی دکھلا سکوں۔[43]

> وہ بات [ظالموں؟] میں نے یونہی لکھ دی تھی، لیکن واقعی حیرت کی بات ہے۔ آپ جانتے ہیں، بمبئی میں کسی کو اردو سے مس نہیں۔ عورتیں جو کچھ سیکھتی ہیں، مردوں سے سیکھتی ہیں۔ ان عورتوں کو اردو داں کہاں ملتے ہیں، باوجود اس کے نہایت بے تکلف صحیح اردو لکھتی ہیں۔[44]

بعض محققین کی طرف سے شبلی و اقبال دونوں پر عطیہ سے شادی کے ارادے کا امکان بھی ظاہر کیا گیا۔ شیخ اکرام نے اس شک کا اظہار کیا کہ 'مولانا [شبلی] ایک زمانے تک یہ خواب دیکھتے رہے کہ نکاحِ ثالث کے متعلق اُن کے جو ارمان تھے، شاید وہ بمبئی کی آزاد فضا میں پورے ہو جائیں'؛[45] لیکن اس سلسلے میں وہ فقط قیاسات سے کام لیتے ہیں، کوئی دلیل پیش نہیں کرتے؛ اسی طرح مسعود الحسن کا گمان ہے کہ اقبال اور عطیہ فیضی کے درمیان ۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء میں سمجھوتا ہو چکا تھا کہ آپس میں شادی کریں گے،[46] جسے خالد نظیر صوفی نے یہ کہتے ہوئے رَد کر دیا کہ اقبال عطیہ کو ایک علمی دوست کی حیثیت سے پسند تو کرتے تھے، لیکن بیوی کے رُوپ میں وہ ان کے لیے ناقابلِ قبول تھیں، کیونکہ وہ جس قسم کی بیوی کے خواہش مند تھے، وہ عطیہ بیگم سے مختلف تھی[47] اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے خیال میں 'انھیں کسی ایسی خاتون کی تلاش تھی، جو ان کی بیوی کی حیثیت سے ان کے خاندان کے افراد سے ان کے گہرے تعلق اور وابستگی کو قائم رکھ سکے'۔[48] دراصل شیخ محمد اکرام اور مسعود الحسن کے بیانات محض چونکا دینے کا سامان کرتے ہیں، ورنہ یہ کسی سنجیدہ تحقیقی کاوش کے نتیجہ نہیں۔

عطیہ سے تعلقات کے پس منظر میں شبلی غالباً 'تخلیقی حدت' کے متلاشی ہیں۔ اس سلسلے

میں مہدی حسن کے نام بعض خط قابلِ توجہ ہیں۔ ۱۱؍ستمبر ۱۹۰۶ء کو بمبئی سے انھیں آگاہ کرتے ہیں کہ 'یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں، آدمی ضبط نہیں کرسکتا'۔ وہ اپالو اور چوپاٹی کی تعجب خیز سیر گاہوں کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انیس برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ شبلی غزل کا شعر بھی نقل کرتے ہیں:[۴۹]

بہر سُو از ہجومِ دلبرانِ شوخ بے پروا
گذشتن از سرِ رہ ، مشکل افتادست رہرو را

اگرچہ اس خط سے عطیہ سے شبلی کے تعلقات کا اندازہ نہیں ہوتا، لیکن ۲۶؍اکتوبر کے خط میں اطلاع دیتے ہیں کہ 'اب کے مخزن میں میری ایک غزل شائع ہوئی ہے،...... 'کافروں' کا ذکر اس میں بھی ہے'[۵۰]۔ ۲؍مارچ ۱۹۰۸ء کے خط میں بمبئی کی دلچسپیوں کے نتیجے میں موزوں ہونے والی سولہ صفحات پر مشتمل 'زیادہ شوخ' غزلوں سے آگاہ کرتے ہیں[۵۱]۔ ۹؍اگست ۱۹۰۸ء کو لکھتے ہیں کہ دستۂ گل کی کم مائگی پر افسوس ہے، 'بمبئی پہنچوں تو کچھ پھول اَور ہاتھ آئیں'[۵۲]۔ ۴؍دسمبر ۱۹۰۹ء کو تحریر کرتے ہیں کہ 'بمبئی سے اب کے بالکل خالی ہاتھ آیا، ایک غزل کا سرمایہ بھی نہ ہوسکا'[۵۳]؛ یعنی بمبئی یا بمبئی کے 'کافروں' سے تعلقات کا حتمی نتیجہ 'غزلوں کا سرمایہ' ہے۔ اس کے برعکس اقبال اپنی زندگی کے نازک ترین دَور میں ایک جذباتی سہارے کی تلاش میں تھے، جو انھیں عطیہ کی صورت میں میسر ہوا۔ یورپ سے واپسی کے بعد اقبال اور ان کی پہلی بیوی کے درمیان تعلقات مزید کشیدہ ہوگئے تو انھوں نے اس سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے والد کے بارے میں یہاں تک لکھ گئے کہ 'انھیں میری شادی کردینے کا کوئی حق نہ تھا، بالخصوص جب کہ مَیں نے اس قسم کے تعلق میں پڑنے سے انکار کردیا تھا'۔[۵۴] اُن حالات میں وہ ہمیشہ کے لیے ترکِ وطن، شراب نوشی، خودکشی اور ابدی اہرمن پر ایمان لانے کی باتیں کرتے ہیں[۵۵]، جن سے ان کی قنوطیت اور مایوسی کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کا کہنا ہے کہ 'ذہنی اور روحانی کرب کی یہ کیفیت محض عارضی تھی اور اقبال کی غیر معمولی قابلیت کو مستقل طور پر مفلوج نہ کرسکتی تھی'[۵۶]۔

جاوید اقبال کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے، کیونکہ ۷؍اپریل ۱۹۱۰ء کے بعد اقبال سنبھلتے چلے گئے اور غالباً سوا سال بعد ۷؍جولائی ۱۹۱۱ء کو عطیہ کو خط لکھنے بیٹھے تو اس سے ہمدردی کے طالب نہیں تھے، بلکہ بڑے اعتماد سے لکھ رہے تھے کہ 'بدنصیبی سایے کی طرح میرے ساتھ لگی رہی ہے اور اس کی اس درجہ وفاداری کی وجہ سے مجھے اس سے اُنس ہوتا جارہا ہے'[۵۷]۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ اس برس سردار بیگم سے اقبال کا نکاح ہوگیا (اگرچہ فوری رخصتی نہ ہوسکی)، تاہم ڈاکٹر جاوید اقبال کا یہ خیال زیادہ قرینِ قیاس محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی تخلیقی قوتوں کی سمت تو پہلے ہی سے متعین تھی، البتہ شعر و نثر کے لباس میں ان کے افشا ہونے کا انتظار تھا[۵۸]۔ چنانچہ مذکورہ خط میں اقبال نے عطیہ کو خبر دی کہ قبلہ والد صاحب نے فرمائش کی ہے کہ حضرت بوعلی قلندر کی مثنوی کی طرز پر ایک فارسی مثنوی [اسرارِ خودی] لکھوں۔ اقبال نے انھیں بتایا کہ 'اس راہ کی مشکلات کے باوجود مَیں نے کام شروع کردیا ہے'[۵۹]۔

عطیہ سے شبلی اور اقبال کے تعلقات کے ادبی ثمرات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عطیہ نے شبلی نعمانی کے حوالے سے محض ایک تحریر 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی' یادگار چھوڑی ہے۔ یہ تحریر دراصل ایک ردِعمل ہے، جس میں وہ خاصی 'غضب ناک' دِکھائی دیتی ہیں؛ جب کہ اقبال کے بارے میں ان کے روزنامچے اور تصنیف *Iqbal* سے کافی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اگرچہ اس تصنیف میں عطیہ نے اقبال کی شخصیت کو مسخ کرنے اور اقبال کی وقتی اور عارضی ذہنی پراگندگی کے بارے میں قیاسی گفتگو کی ہے، تاہم اقبال کی زندگی کے اس عرصے کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب سُودمند ثابت ہوئی ہے۔

علامہ شبلی کے بارے میں عطیہ کا پہلا تاثر یہ تھا کہ 'ہم بہنیں ان کی باتوں سے بہت متاثر اور محظوظ ہوئیں۔ اُس وقت وہ ایک پرانے خیال کے مولوی معلوم ہوتے تھے'[۶۰]۔ بعد میں بمبئی کی ملاقاتوں کے بارے میں عطیہ نے لکھا کہ یہ ملاقاتیں 'بے تکلفانہ ہوتیں تھیں اور کبھی کبھی ان ملاقاتوں میں عطیہ کے خاندان کی اَور بیگمات بھی شریک ہوتی تھیں۔ ایسے

مواقع پر، عطیہ کے مطابق، 'علمی، قومی، سیاسی باتیں ہوتی تھیں'۔ عطیہ نے لکھا کہ 'ان ملاقاتوں میں اب وہ پہلے سے مولانا نہ تھے۔ نہایت آزادخیال، عورتوں کی سوسائٹی میں بے تکلف شرکت کرتے تھے، رسمی ورواجی پردے کے علمی وعملی طور پر مخالف تھے۔ تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے۔ شعروشاعری اور مہذب لطائف وظرائف اور خیالات کی یکسانی سے یہ ملاقاتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں'[۶۱] لیکن عطیہ کے کسی بیان سے علامہ شبلی کی زندگی کے کسی اہم گوشے پر روشنی نہیں پڑتی؛ البتہ منشی محمد امین زبیری کی تحریک پر معرض تحریر میں آنے والے مذکورہ 'وضاحت نامے' میں عطیہ نے شبلی کی شخصیت سے متعلق بعض ناگفتنی ضرور لکھ دیں۔

جہاں تک اقبال سے عطیہ کے مراسم کے علمی نتائج کا تعلق ہے، عطیہ کہتی ہیں کہ 'اقبال کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ ذہنی پیچیدگی کا شکار ہیں، اچھائی اور برائی کا مجموعہ ہیں، اُن کی زندگی کا محور اُن کی اپنی ذات ہے اور وہ اپنے نظریات کو اہمیت دینے کے شوقین ہیں'[۶۲] لیکن کچھ دیر تک باہم گفتگو کے بعد انھیں اندازہ ہوا کہ 'اقبال فارسی اور عربی کے علاوہ سنسکرت میں بھی اچھی دست گاہ رکھتے ہیں' اور یہ کہ 'اقبال کو حسب خواہش اپنے تئیں دلچسپ اور خوش گوار بنانے کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ سوسائٹی میں وہ بہت زندہ دلی کا ثبوت دیتے تھے اور حاضر جوابی میں یا تعریف کرنے میں وہ کبھی نہیں جھجکتے تھے، اگرچہ بسا اوقات ان کے مذاق میں طنز کا رنگ نمایاں ہوتا تھا'۔[۶۳] اس پر مستزاد وہ اہم ترین واقعات ہیں، جو محض عطیہ سے تعلقات کے باعث محفوظ رہ گئے۔ ان میں تین زیادہ اہم ہیں، یعنی کابل سے آنے والے قافلے کے ایک مسافر کا علاج معالجہ اور اس کی شفایابی،[۶۴] اقبال کی پہلی شادی کے باعث رونما ہونے والی تلخی اور اس کے زیرِ اثر اقبال کے انتہائی مایوس کن خیالات[۶۵] اور اقبال کی سیاحت قرطبہ کے دوران ان کی سیکرٹری کے خیالات میں حیرت انگیز تغیر۔[۶۶] مذکورہ بالا تصنیف کے آخری صفحات میں عطیہ نے اگرچہ اقبال کی جینئس کے دب جانے[۶۷] اور ان کی ذکاوت، طباعی اور آب وتاب کو گھن لگنے[۶۸] کی بات کی ہے، لیکن ساتھ

ساتھ اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے:

> Iqbal's method of thinking was different from the rest of the known writers of the world, and I can only say that the root cause of this distinction lay in the knowledge he had absorbed from the Quranic teaching. I will not say that he fully realized the internal meaning that lies underneath the words of the Quran, but he certainly based many of his ideas on this holy and inspired structure and was the richer for such knowledge.

> [اقبال کا تخیل دنیا بھر کے دوسرے مصنفین کے مقابلے میں بالکل اچھوتا تھا اور میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس امتیاز کی بنیادی وجہ اس علم میں مضمر ہے، جو انھوں نے قرآنی تعلیمات سے اخذ کیا تھا۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ انھوں نے قرآنی الفاظ کے حقیقی مفہوم کا کلی طور پر احساس کرلیا تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنے بہت سے خیالات کی بنیاد اس مقدس اور الہامی کتاب پر رکھی تھی اور اسی علم کی بدولت ان میں زیادہ شان پیدا ہوگئی تھی۔][۶۹]

مذکورہ بحث، اکابر میں سے کسی کو فوقیت دینے کے لیے نہیں، بلکہ عطیہ کی ذہنی افتاد کے مقابل شبلی واقبال کی شخصیات کا جائزہ لینے کے لیے ہے۔ سید شہاب الدین دسنوی کے خیال میں عطیہ نے شبلی اور اقبال، دونوں کو اپنے ادبی اور علمی ذوق سے متاثر کرنے کی کوشش کی اور وہ کوشش کامیاب بھی رہیں۔[۷۰] اسی طرح وہ سر عبدالقادر اور مولانا ابوالکلام آزاد، سب کو بیک وقت اپنی صلاحیت، آزاد خیالی، بیباکی اور ثقافتی دلچسپیوں سے مرعوب، بلکہ متاثر کرنے میں لگی رہتی تھیں۔[۷۱] اب دیکھنا یہ ہے کہ شبلی واقبال، عطیہ کے اس حصار سے رہائی پاسکے یا نہیں؟

عطیہ سے شبلی کی پہلی ملاقات ۱۹۰۶ء میں ہوئی اور ۱۱ر مئی ۱۹۱۱ء تک ان سے خط کتابت جاری رہی۔ یہ اور بات ہے کہ آخری خط تک تعلقات کی نوعیت اتنی مختلف ہوچکی

تھی کہ...... اس ستم ظریفی کو دیکھیے ، مہینا بھر بمبئی میں رہیں اور مطلق خبر نہ دی...... اس کے بعد عطیہ کے نام شبلی کا کوئی خط نہیں ملتا اور نہ ملاقات کی خبر ملتی ہے، لیکن اس خاندان سے شبلی کے روابط برابر استوار رہے۔ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۴ء کے دورۂ بمبئی میں زہرا فیضی، شبلی کو کھانے پر مدعو کرتی رہیں اور شبلی اسے قبول کرتے رہے[۱۲]۔ ۵/ اگست ۱۹۱۴ء کو شبلی کے بھائی مولوی محمد اسحاق کا انتقال ہو گیا تو وہ اس صدمے سے نڈھال ہو گئے، تاہم زہرا کے نام ۱۳/ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں عطیہ کو یاد کرتے ہیں:

> آہ، کیا لکھوں! مَیں اب کسی کام کا نہیں رہا۔ برادرِ مرحوم کی وجہ سے مَیں آزاد پھرتا تھا اور جہاں چاہے، رہتا تھا: اب وطن سے نکلنا محال سا ہو گیا ہے۔ مرحوم گھر بھر کا چراغ تھا اور سب کاروبار اُس کی بدولت چلتا تھا۔ آپ لوگوں کے دیکھنے کو ترسوں گا۔ کاش! آپ یا عطیہ کبھی یہاں آتیں اور دس پانچ دن اس ویرانے میں بسر کرتیں۔ عطیہ اگر آ جائیں تو بہت سلام شوق کہیے اور کہیے کہ کاش! وہ میرے گھر آ کر تعزیت کرتیں کہ دل کو تسکین ہو سکتی[۱۳]۔

یعنی وفات (۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء) سے تقریباً ایک مہینا پہلے تک شبلی کی تحریروں میں عطیہ کا ذکر ملتا ہے: گویا انچاس برس کی عمر میں عطیہ سے پہلی ملاقات سے ستاون برس کی عمر تک شبلی کے دل میں ان کی یاد باقی رہی۔

اقبال کی عطیہ سے پہلی ملاقات یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو ہوئی، لیکن دو ہی برس کے بعد تعلقات نے وہ رنگ اختیار کیا کہ اقبال کو 'صفائیوں' اور 'وضاحتوں' سے گزرنا پڑا، لیکن عطیہ کی ناراضی کی لَے بتدریج بلند ہوتی گئی۔ یوں لگتا ہے کہ ۷/ اپریل ۱۹۱۰ء کو لکھا گیا خط تعلقات کو خوش گوار رکھنے کی آخری کوشش تھی، کیونکہ ۷/ جولائی اور ۴/ دسمبر ۱۹۱۱ء کے خطوط سابقہ تعلقات کا تسلسل نہیں کہے جا سکتے۔ حیرت ہے کہ رسمی تعلقات سے قطع نظر اقبال نے اپنی کسی تحریر، تقریر یا گفتگو میں عطیہ سے ملنے اور کسی موقع پر اسے پکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگر بمبئی میں عطیہ اور اقبال کی تین مرتبہ ملاقات ہوئی بھی تو اُس وقت، جب عطیہ

نے رحمین سے شادی کر لی تھی: اور یہ بھی یاد رہے کہ اُن دنوں یورپ جانے کے لیے بمبئی ہی سے گزرنا پڑتا تھا۔

۱۔ عطیہ فیضی: 'مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی'، مطبوعہ ادبی دنیا، جولائی اگست ۱۹۴۶ء، بحوالہ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، بمبئی: تاج آفس، س ن، ص ۲۷۳

۲۔ ڈاکٹر جاوید اقبال: زندہ رود، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، دوم ۲۰۰۸ء، ص ۵۰۴، ۵۱۱، ۵۴۶

۳۔ عطیہ فیضی: Iqbal، لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۔ اقبال کے الفاظ۔

Most of these letters took their course of going out of existence after being replied to, as they did not appear to have any significance then.

۴۔ شبلی بنام عطیہ، ۱۴/۸/۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی مرتبہ مولوی محمد امین زبیری و سید محمد یوسف قیصر، بھوپال: عکل السطان بک ایجنسی، س ن، ص ۶۴

۵۔ اقبال بنام عطیہ، ۷/۷/۱۹۱۱ء، Letters of Iqbal، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، دوم ۲۰۰۵ء، ص ۳۵

۶۔ شبلی بنام عطیہ، ۲۸/۳/۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۳۹

۷۔ شبلی بنام عطیہ، ۱۹/۸/۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۶۶

۸۔ اقبال بنام عطیہ، ۹/۴/۱۹۰۹ء، Letters of Iqbal، محولہ بالا ۵، ص ۲۲۔ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۵ء، ص ۴۲۸

۹۔ شبلی بنام عطیہ، ۷/۱۱/۱۹۰۸ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۴۵

۱۰۔ اقبال بنام عطیہ، ۱۷/۴/۱۹۰۹ء، اقبال نامہ، ص ۴۲۹۔ اقبال کے الفاظ:

I often see Abdul Qadir, almost every day in the Bar Room of the Cheif Court, but we have not talked about you for a long time. *(Letters of Iqbal, p-23)*، محولہ بالا ۵

۱۱۔ ایضاً۔ اقبال کے الفاظ: I do not talk much with others

(Letters of Iqbal, p-23) محولہ بالا ۵

۱۲۔ شبلی بنام عطیہ، ۲۸/۵/۱۹۱۱ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۸۴

۱۳۔ اقبال بنام عطیہ، ۷/۴/۱۹۱۰ء، Letters of Iqbal، محولہ بالا ۵، ص ۳۲۔ ۳۳۔ اقبال نامہ، ص ۴۳۳

۱۴۔ شبلی بنام عطیہ، ۱۴/۸/۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۶۵

۱۵۔ شبلی بنام عطیہ، ۱۹/۸/۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۶۶

۱۶۔ اقبال بنام عطیہ، ۱۷/۷/۱۹۰۹ء، Letters of Iqbal، محولہ بالا ۵، ص ۲۶۔ اقبال نامہ، ص ۴۳۳

۱۷۔ شبلی بنام عطیہ، ۲۳/۳/۱۹۰۸ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۳۴

۱۸۔ شبلی بنام عطیہ، ۷/۱۰/۱۹۰۸ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۴۰

۱۹۔ شبلی بنام عطیہ، ۲۷/۶/۱۹۰۸ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۴۷

۲۰۔ شبلی بنام عطیہ، ۱۵/۷/۱۹۰۸ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۴۷

۲۱۔ شبلی بنام عطیہ، ۱۳/۱۰/۱۹۱۰ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۷۸

۲۲۔ شبلی بنام عطیہ، ۲/۱۱/۱۹۱۰ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۷۸

۲۳۔ شبلی بنام عطیہ، ۹/۶/۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۵۴

۲۴۔ شبلی بنام عطیہ، ۲۱/۶/۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۵۶

۲۵۔ اقبال بنام عطیہ، ۱۳/۱/۱۹۰۹ء، اقبال نامہ، ص ۴۲۶

۲۶۔ شبلی بنام عطیہ، ۹/۶/۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۵۴

۲۷۔ شبلی بنام عطیہ، س ن، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۶۲-۶۳

۲۸۔ شبلی بنام عطیہ، ۱۳/۱/۱۹۱۰ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۷۴-۷۵

۲۹۔ شبلی بنام عطیہ، ۲۳/۲/۱۹۰۸ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۳۴

۳۰۔ اقبال بنام عطیہ، ۱۷/۷/۱۹۰۹ء، Letters of Iqbal، محولہ بالا ۵، ص ۲۶-۲۷۔ اقبال نامہ، ص ۴۳۴-۴۳۵

۳۱۔ اقبال بنام عطیہ، ۱۷/۷/۱۹۰۹ء، Letters of Iqbal، محولہ بالا ۵، ص ۲۷۔ اقبال نامہ، ص ۴۳۵

۳۲۔ اقبال بنام عطیہ، ۹/۴/۱۹۰۹ء، اقبال نامہ، ص ۴۲۷۔ اقبال کے الفاظ:

This is confidence; please do not tell anybody. (*Letters of Iqbal*, p-22)، محولہ بالا ۵

۳۳۔ اقبال بنام عطیہ، ۱۷/۴/۱۹۰۹ء، اقبال نامہ، ص ۴۲۸۔ اقبال کے الفاظ:

Your letters to me are always kept in a safe chest; nobody can see them. (*Letters of Iqbal*, p-23)، محولہ بالا ۵

۳۴۔ مولوی محمد امین زبیری (مرتب): دیباچہ خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۳-۴

۳۵۔ شبلی بنام عطیہ، ۹/۶/۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۵۴

۳۶۔ شبلی بنام عطیہ، ۱۵/۷/۱۹۰۹ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۵۹

۳۷۔ شبلی بنام عطیہ، ۱۳/۱۰/۱۹۱۰ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۷۷

۳۸۔ شبلی بنام عطیہ، ۷/۱۰/۱۹۰۸ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۴۰-۴۱

۳۹۔ شبلی بنام ایم مہدی حسن، ۱۱/۱۰/۱۹۰۸ء، مکاتیبِ شبلی دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۱۹۷۱ء، ص ۲۱۹

۴۰۔ شبلی بنام عطیہ، ۷/۱۱/۱۹۰۸ء، خطوطِ شبلی، محولہ بالا ۴، ص ۴۵

۴۱۔ شبلی بنام ایم مہدی حسن، ۲۳/۱۱/۱۹۰۸ء، مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۲۲۰

۴۲۔ شبلی بنام ایم مہدی حسن، ۱۲/۱۲/۱۹۰۸ء، مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۲۲۰-۲۲۱

۴۳۔ شبلی بنام عبدالقادر، ۵/۵/۱۹۰۸ء، مکاتیبِ شبلی اول، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۶

۴۴۔ شبلی بنام عبدالقادر، ۱۹/۵/۱۹۰۸ء، مکاتیبِ شبلی اول، ص ۲۰۷

۴۵۔ شیخ محمد اکرام: یادگارِ شبلی، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ص ۳۳۸

۴۶۔ مسعود الحسن: حیاتِ اقبال (انگریزی)، ص ۷۷، بحوالہ ڈاکٹر جاوید اقبال: زندہ رود، محولہ بالا ۲۱، ص ۲۱۷

۴۷۔ خالد نظیر صوفی: اقبال درونِ خانہ، اول، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، سوم ۲۰۰۸ء، ص ۹۳

۴۸۔ ڈاکٹر جاوید اقبال: زندہ رود، محولہ بالا ۲۱، ص ۲۰۳

۴۹۔ شبلی بنام ایم مہدی حسن، ۱۱/۹/۱۹۰۶ء، مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۲۰۷

۵۰۔ شبلی بنام ایم مہدی حسن، ۲۶/۱۰/۱۹۰۶ء، مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۲۰۸

۵۱۔ شبلی بنام ایم مہدی حسن، ۲/۳/۱۹۰۸ء، مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۲۱۵

۵۲۔ شبلی بنام ایم مہدی حسن، ۹/۸/۱۹۰۸ء، مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۲۱۶

۵۳۔ شبلی بنام ایم مہدی حسن، ۴/۱۲/۱۹۰۹ء، مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۲۲۲

۵۴۔ اقبال بنام عطیہ، ۹/۴/۱۹۰۹ء، اقبال از عطیہ بیگم، مترجم: ضیاء الدین احمد برنی، لاہور: آئینہ ادب، دوم ۱۹۶۹ء، ص ۵۱

۵۵۔ اقبال بنام عطیہ، ۹/۴/۱۹۰۹ء، اقبال نامہ، ص ۴۲۷

۵۶۔ ڈاکٹر جاوید اقبال: زندہ رود، محولہ بالا ۲۱، ص ۲۰۲

۵۷۔ اقبال بنام عطیہ، ۷/۷/۱۹۱۱ء، اقبال نامہ، ص ۴۳۵۔ اقبال کے الفاظ:

My misfortune has been following me like a faithfu dog; and I have learnt to like the Dame for her untiring loyalty to her miserable king. [*Letters of Iqbal*, p-35]، محولہ بالا ۵

۵۸۔ ڈاکٹر جاوید اقبال: زندہ رود، محولہ بالا ۲۱، ص ۲۰۲

۵۹۔ اقبال بنام عطیہ، ۷/۷/۱۹۱۱ء، اقبال نامہ، ص ۴۳۶

۶۰۔ شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، بمبئی: تاج آفس، س ن، ص ۲۷۳

۶۱۔ ایضاً، ص ۲۷۴

۶۲۔ خرم علی شفیق: اقبال تشکیلی دور، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۳

۶۳۔ عطیہ فیضی: اقبال مترجمہ ضیاءالدین احمد برنی، ص ۲۳۔ اقبال کے الفاظ:

Iqbal had a way of making himself pleasant and agreeable when he liked. In company he was vivacious and was never at a loss for wit or compliment, but in most cases it was cynicism the predominated. [*Iqbal*, p-15]

۶۴۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، عطیہ فیضی: *Iqbal*، ص ۸-۹

۶۵۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، اقبال بنام عطیہ، ۹/۴/۱۹۰۹ء، مشمولہ *Letters of Iqbal*، بحوالہ بالا ۵، ص ۴۱

۶۶۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، اقبال بنام عطیہ، ۲۹/۵/۱۹۳۳ء، مشمولہ *Letters of Iqbal*، بحوالہ بالا ۵، ص ۳۹

۶۷۔ عطیہ فیضی: *Iqbal*، ص ۸۹۔ اقبال کے الفاظ:

Iqbal's genius was suppressed instead of being developed.

۶۸۔ عطیہ فیضی: *Iqbal*، ص ۹۲۔ اقبال کے الفاظ:

In India his brilliance was blotted out.

۶۹۔ عطیہ فیضی: *Iqbal*، ص ۹۱۔ اقبال مترجمہ ضیاءالدین احمد برنی، ص ۹۰

۷۰۔ سید شہاب الدین دسنوی: علامہ شبلی نعمانی معاصرانہ تنقید کی روشنی میں، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۸۹ء، ص ۵۸

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۷۲۔ شبلی بنام زہرا، ۱/۷/۱۹۱۲ء، ۳/۶/۱۹۱۲ء، ۱۳/۶/۱۹۱۲ء، خطوط شبلی، بحوالہ بالا ۳۱، صفحات بالترتیب ۱۱۶، ۱۱۹، ۱۱۹

۷۳۔ شبلی بنام زہرا، ۱۳/۱۰/۱۹۱۲ء، خطوط شبلی، بحوالہ بالا ۳۱، ص ۱۳۲

□□□

شبلی اور حالی

تعلقات کا ازسرِ نو جائزہ

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی کے باہمی تعلقات ہمیشہ خوش گوار رہے، جن کا اظہار دونوں کے سوانحی حالات اور پھر ان کی مراسلت سے لگایا جا سکتا ہے۔ حالی عمر میں شبلی سے بیس برس بڑے تھے، لیکن تعلقات کی نوعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی نے شبلی کا بزرگ بننے کی کوشش نہیں کی، شاید وہ برادرِ بزرگ بننے کو بھی تیار نہ تھے، یہی وجہ ہے یہ کہ انھوں نے زندگی بھر شبلی کا احترام ملحوظ رکھا۔

شبلی و حالی کے مابین بعض امور میں اگر کبھی اختلاف ہوا بھی تو دھیمے سُروں میں؛ لیکن مہدی افادی، مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی نے دونوں بزرگوں کے درمیان اختلافات کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔

مہدی افادی نے اپنے ایک مضمون 'حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک'[1] کے ذریعے ان 'اختلافات' کو خوب ہوا دی، لکھتے ہیں کہ 'اصلی کام حالی و شبلی کو باہم ٹکرانا ہے'[2] مضمون میں اس 'چشمک' کی کئی ایک مثالیں دینے کے بعد مہدی کہتے ہیں کہ 'یہاں تک تو چشمک کی صرف نرم مثالیں تھیں، یعنی تلخ گولیاں غلافِ شکر میں، اَب ذرا قوی شواہد لیجیے'[3] البتہ مضمون کے آخر میں یہ بیان داغ دیتے ہیں کہ 'میری غایت محض تنقیدِ ادب، یعنی احباب کی دماغی تفریح کے سوا اور کچھ نہیں ہے'[4] لیکن یار لوگ تو 'معاصرانہ چشمک' کو لے اُڑے، حتیٰ کہ اس جملے کی بازگشت آج تک سنائی دے رہی ہے۔ اس حوالے سے آلِ احمد سرور کا تبصرہ

بہت اہم ہے، لکھتے ہیں:

> ہم لوگوں میں یہ ایک عام کمزوری ہے کہ پہلے انسانوں کے بُت بناتے ہیں اور پھر ان بتوں کو آپس میں ٹکرا کر خوش ہوتے ہیں۔ خدا جانے، کس گھڑی میں مہدی افادی نے حالی اور شبلی کی 'معاصرانہ چشمک' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا کہ اب ادبی حلقوں میں حالی و شبلی کا موازنہ اور ایک کو دوسرے سے بڑھانے یا گھٹانے کی کوشش اچھا خاصا فرض بن گئی ہے۔[۵]

عبداللطیف اعظمی کا کہنا ہے کہ 'موصوف [مہدی افادی] نے صرف معاصرانہ چشمک کی تصنیف ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے بہت سے خطوط میں بھی اس کی شکایت کی ہے'۔[۶] یوں یہ روایت آگے بڑھتی رہی، چنانچہ ان 'اختلافات' کو نمایاں کرنے میں مولوی عبدالحق کی 'خدمات' بھی قابلِ ذکر ہیں۔ مولوی صاحب کے خیال میں، حالی کے برعکس 'شبلی کی طبیعت میں ضبط بالکل نہ تھا'، چنانچہ 'جب کبھی ان کے دل میں کوئی بات آتی تو فوراً کہہ گزرتے'۔ مولوی صاحب کے مطابق، 'وہ نجی صحبتوں میں ایسی باتیں کرتے تھے، جن سے سرسید اور مولانا حالی کی تنقیص نکلتی تھی'، اس سلسلے میں انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے:

> جن دنوں حیات جاوید شائع ہوئی تو مولانا شبلی کے لیے، جو اُس وقت اتفاق سے حیدر آباد میں وارد تھے، مَیں نے یہ کتاب لے جاکر ان کی خدمت میں پیش کی۔ اُس وقت وہاں اَور بھی کئی اشخاص موجود تھے۔ مولانا شبلی نے یہ کتاب دیکھتے ہی فرمایا، 'یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے'۔ مولانا نے کتاب کو پڑھے بغیر ہی یہ رائے دے دی۔[۷]

اگر اس بیان کا جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے یہ فرض کرکے کہ حیات جاوید کا اوّلین نسخہ اُن کے پاس آیا، انھی نے اسے شبلی کے سامنے پیش کیا اور شبلی نے بغیر تردد کے اس پر تبصرہ کردیا، حالانکہ بقول شیخ محمد اکرام، 'وہ [شبلی] کتاب کی عام اشاعت سے پہلے اسے یا اس کے بعض اجزا دیکھ چکے تھے'۔[۸] ویسے بھی حیات جاوید سے متعلق شبلی کی تنقیدی رائے کوئی راز کی بات نہیں، بلکہ اس کا اظہار تو انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں

شروانی کے نام اپنے دو خطوط میں بھی کیا ہے (جن کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا)۔

مولوی صاحب مولانا حالی کو 'بڑے صاحب دل آدمی' قرار دیتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ حالی نے 'ان [شبلی] کی کتابوں پر بڑے اچھے تبصرے کیے اور جو باتیں قابلِ تعریف تھیں، ان کی جی بھر کر داد دی'۔ مولوی صاحب کی یہ بات بالکل درست ہے۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۰۶ء کو حالی نے شبلی کو ایک طویل خط لکھا، جس سے دونوں کے تعلقات کی گہرائی، خلوص اور باہمی عقیدت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ شبلی کی تصانیف کے بارے میں حالی کے خیالات کا اظہار بھی۔ حالی لکھتے ہیں:

> اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے وُرود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کام کیا، جو پیراہنِ یوسف نے چشمِ یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔
>
> میری کوتاہ قلمی سے اگر آپ یہ سمجھے ہوں تو کچھ تعجب نہیں کہ مَیں آپ کے حقوقِ صحبت کو بھول گیا ہوں، مگر مولانا! یہ تغافل اسی قسم کا ہے، جس کی نسبت کہا گیا ہے...... تغافلے کہ کم از صد نگاہ حسرت نیست۔ مَیں اپنے حالات کی تفصیل لکھ کر آپ کو ملول کرنا نہیں چاہتا۔
>
> آپ کے گراں بہا عطیہ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، گو اس سے پورا پورا مستفید نہیں ہو سکتا۔ ایک آنکھ سے بالکل نظر نہیں آتا، دوسری آنکھ میں بھی موتیا کا پانی آنا شروع ہو گیا ہے۔ داہنی آنکھ بنوانے کا ارادہ ہے، لیکن کھانسی کی وجہ سے فروری تک آپریشن کرانا ملتوی کر دیا ہے۔...... چونکہ مَیں بذاتِ خود کتابوں سے کماحقہٗ استفادہ حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے اپنی ہوس کو اس طرح پورا کرتا ہوں کہ اَور لوگوں کے لیے لائبریری سے کتابیں منگواتا ہوں...... اسی بنا پر سوانح مولانا روم لائبریری کی طرف سے منگوائی گئی تھی، لیکن چونکہ وہ آپ نے خاص میرے لیے عنایت فرمائی ہے، اس لیے اس کو اپنے پاس رکھوں گا اور لائبریری کے لیے دوسرا نسخہ اسی درجے کا بصیغہ ویلیو پے ایبل ارسال فرمانا ہوگا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ کی جملہ تصانیف لائبریری میں آ گئی ہیں۔ صرف الغزالی اَب تک نہیں آئی تھی، لیکن اَب عبداللہ خاں کو حیدر آباد لکھ دیا گیا ہے کہ اس کا ایک نسخہ فوراً بھیج دیں۔ مجھے ٹھیک معلوم نہیں کہ المامون اور سیرۃ النعمان بھی آ گئی ہیں یا نہیں، مَیں لائبریرین سے دریافت

کر کے ان کے لیے بھی شاید تکلیف دوں۔ باقی الفاروق، سفر نامہ روم ومصر وغیرہ، رسائل شبلی، تاریخ علم کلام کے دونوں حصے [الکلام اور علم الکلام]، یہ سب کتابیں لائبریری میں موجود ہیں۔ سوانح کے ساتھ دیوان فارسی بھی پارسل میں شامل کرا دیجیے گا۔ سوانح [مولانا روم] کو میں اب تک ایک سرسری نظر سے دیکھ سکا ہوں۔ اوّل مولوی وحید الدین دیکھنے کو لے گئے، ان کے بعد غلام حسین نے مانگ لی۔ آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ من حرف منزلتکم فی الصنیف کل لسانہ آپ کا وجود قوم کے لیے باعث فخر ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ وسلامت رکھے۔

موازنۂ انیس ودبیر کا مسودہ میں نے میر کاظم علی صاحب معتمد تعمیرات سرکار عالی سے بڑے تقاضوں کے ساتھ حیدرآباد میں منگوا کر دیکھا تھا اور جس رقعہ کے ساتھ ان کے دفتر میں اس کو واپس بھیجا تھا، اس میں ان کو بہت غیرت دلائی تھی کہ اب تک اس کے شائع کرنے کا یہاں کسی کو خیال نہیں آیا، یا تو سرکار کی طرف سے آپ اس کو چھپوا دیں یا بعض اشخاص، جو اس کے چھاپنے پر آمادہ ہیں، ان کو اجازت دے دیں اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اس مسودے کو خود مولانا کے پاس بھجوا دیں، کیونکہ اس میں جابجا کورے اوراق چھوڑ دیے گئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس میں کچھ اور اضافہ کرنا منظور ہے۔ میر کاظم علی صاحب نے بہت دن کے بعد اس کا یہ جواب دیا کہ سرکار سے اس کے چھاپنے کی منظوری لے لی گئی ہے، لیکن باوجود اس کے کہ میں اس کے بعد کئی مہینے تک وہاں ٹھہرا رہا، میرے سامنے اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ بفرض محال چھپتا بھی تو بالکل مسخ ہوتا۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ یہاں چھپنے کو دے دیا۔ جب موازنہ بالکل چھپ جائے تو ازراہِ عنایت اس کی بھی ایک جلد سیکرٹری وکٹوریا میموریل لائبریری کے نام ضرور بصیغۂ ویلو پی ایبل بھجوا دیجیے گا۔[59]

یہی نہیں کہ مولانا حالی شبلی کی قدر کرتے تھے، بلکہ جہاں انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ شبلی کو نظر انداز کیا گیا ہے، وہ اس پر حیرت کا اظہار کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے ایک فہرست تیار کی، جس میں کچھ ایسے لوگوں کا انتخاب کیا گیا تھا، جن کے کام پر تنقیدی مضامین لکھنے کا منصوبہ تھا۔ دانستہ یا نادانستہ اس میں شبلی کا نام شامل نہ ہو سکا تو مولانا حالی نے انھیں لکھا:

جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان کے کام پر کریٹکل ایسے [critical essay] لکھے جائیں، ان میں سے ایک شخص کا نام ہونے اور ایک کا نہ ہونے سے نہایت تعجب ہوا۔ مولوی سید احمد صاحب میرے نہایت دوست ہیں اور اردو ڈکشنری لکھنے میں جو محنت اور استقلال انھوں نے دکھایا ہے، اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ ان کی ڈکشنری پر ۸۸ء میں ایک لمبا ریویو میں خود لکھ چکا ہوں، مگر ماڈرن اردو لٹریچر کا ہیرو میں اُن کو نہیں کہہ سکتا اور اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلما مولوی شبلی نعمانی کا نام چھوڑ دینے پر ہے۔ اس فروگذاشت کو سوا اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو، میں اور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا۔[60]

خود مولوی عبدالحق نے بھی ایک واقعہ بیان کیا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ شبلی پر بے جا تنقید پر بھی حالی خاموش نہیں رہتے تھے۔ اگرچہ ان کا لہجہ دھیما ہوتا تھا، لیکن وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔ ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خاں نے دکن ریویو میں مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر دو مضامین لکھے، جن میں بقول مولوی عبدالحق، 'کسی قدر شوخی سے کام لیا گیا تھا'۔ جب حالی حیدرآباد جانا ہوا تو ان کی ظفر علی خاں سے ملاقات ہو گئی۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:

دورانِ گفتگو میں انھوں نے متذکرے مضامین کے متعلق ظفر علی خاں کو ایسے شفقت آمیز پیرایے میں نصیحت کرنا شروع کی کہ ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور وہ سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا، میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیونکر ہوگی، لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔[61]

مندرجہ بالا اقتباسات سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حالی کے دل میں شبلی کی بڑی قدر تھی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شبلی بھی 'بڑے صاحب دل آدمی' تھے۔ نواب محسن الملک کے

نام ۱۹ر اپریل ۱۹۰۳ء کے خط میں شبلی نے حالی کو 'ہمارے بزرگ مولانا حالی' کہہ کر یاد کیا ہے۔[12] حالی نے شبلی کو حیات سعدی کا نسخہ بھیجا تو شبلی نے اُس پر نہ صرف تبصرہ کیا، بلکہ مولوی محمد سمیع کو اس کے مطالعے کی ترغیب دلاتے ہوئے لکھا:

> یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے۔ مَیں نے بے اختیار اس کو تمھارے لیے پسند کیا اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمھارے نام بھیج دیں۔ دیکھو، کہیں واپس نہ جائے، قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے۔ واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس کتاب کے اَور خریدار پیدا کرنے چاہییں۔[13]

گویا مولوی صاحب جن معنوں میں مولانا حالی کو 'بڑے صاحب دل آدمی' قرار دیتے ہیں، شبلی بھی انھی اوصاف سے متصف تھے۔ اس بات کے ثبوت میں ایک اَور مثال پیش کی جا سکتی ہے، یعنی جب شعر العجم کی دوسری جلد میں شیخ سعدی کے حالات قلم بند کرنے کا وقت آیا تو شبلی نے حاشیے میں حالی کو درج ذیل الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

> مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیات سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا، اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے، لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔[14]

شبلی یادگارِ غالب کے متعلق بھی نہایت اچھی رائے رکھتے تھے۔ شیخ رشید الدین انصاری کے کسی سوال کے جواب میں شبلی نے لکھا کہ 'مرزا غالب کے حالات و ریویو حالی صاحب نے جس تفصیل سے لکھے ہیں، اس کے بعد کسی اَور کتاب کی کیا ضرورت ہے'۔[15]

شبلی و حالی کے مابین اختلافات پر گفتگو کرنے کے بعد مہدی افادی کی طرح مولوی عبدالحق بھی وضاحت کرتے ہیں کہ 'مولانا شبلی کو مولانا حالی سے کوئی بغض نہ تھا'۔[16] سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ دونوں بزرگوں کے دلوں میں کوئی بغض نہیں تھا تو پھر ان کے مابین مبینہ 'اختلافات' کو نمایاں کرنے کا کیا سبب تھا۔

حیات شبلی میں سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ مولانا شبلی کو اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت، محبت اور اُلفت تھی، ساتھ ہی دو اقتباسات دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ 'یہ چوٹ مولانا حالی پر ہے'، حالانکہ دونوں اقتباسات میں حالی کا براہِ راست ذکر نہ تھا؛ البتہ حیات جاوید سے متعلق ایک دو جملوں سے شبلی کی ناپسندیدگی ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ حبیب الرحمٰن شروانی کے نام شبلی نے حیات جاوید کو سید صاحب کی یک رُخی تصویر اور مدلل مداحی قرار دیا۔[17] اس سے پہلے وہ یہ بھی لکھ چکے تھے کہ 'حیات جاوید کو مَیں لائف نہیں، کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل'۔[18]

چونکہ حالی کی نسبت سرسید سے شبلی کی قربت بہت زیادہ تھی، چنانچہ بقول شیخ محمد اکرام، 'اگر ان [شبلی] کی طبیعت کو کسی معاصر کے حالات لکھنے گوارا ہوتے تو وہ حالی کی نسبت کہیں زیادہ مکمل اور زیادہ دلچسپ تصویریں پیش کرتے'۔ ان کے نزدیک 'حالی کا کام ایک ریسرچ سکالر کا تھا، انھوں نے سرسید کے کریکٹر اور کارناموں کے بنیادی پہلوؤں اور بنیادی احسانات کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیا، لیکن پھر بھی کئی اہم معاملات کے اہم پہلو رہ گئے ہیں'،[19] اور آلِ احمد سرور نے حالی کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا تھا کہ 'وہ وہاں بھی خاموش رہتے ہیں، جہاں خاموشی گناہ ہے'، چنانچہ 'انھوں نے سرسید کی بہت سے کوتاہیوں کی تاویلیں کی ہیں'۔[20]

حالی سے متعلق شبلی کے مذکورہ بالا خیالات پر خود ان کے قریبی دوست مہدی افادی نے سخت ردِ عمل کا اظہار کیا تھا۔ اگرچہ ان کا یہ کہنا ادبی تنقید کا حصہ نہیں بن سکتا کہ 'شیش محل میں بیٹھ کر اَوروں پر پتھر پھینکنا ایک خوش ادائی سہی، لیکن کیا دانائی بھی ہے'،[21] البتہ ان کا یہ سوال قابلِ توجہ ہے کہ 'بلحاظِ فن حالی کے جس اقتصار کی طرف نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے، خود ان کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے، یعنی المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک اُبھار کر دکھائی گئی ہے؟'[22]

بہر حال، کسی ہم عصر کی ایک کتاب پر تنقیدی رائے سے 'معاصرانہ چشمک' کا مذکور غالباً عجلت پسندی ہے، ورنہ تو شبلی مولانا حالی کے علم و عرفان کے نہ صرف قائل تھے، بلکہ انھیں خود پر برتری دیتے تھے۔ خود کو دریا اور حالی کو کنویں سے تشبیہ دیتے ہوئے انھوں نے اس امر کا اعتراف کیا:

> جب تک کافی موادِ تحریر موجود نہ ہو، میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ اُن کی دقیقہ رَس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے، جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا۔[۲۳]

اس کے ثبوت میں سید سلیمان ندوی کا درج ذیل بیان نہایت اہم ہے:

> مولانا کو اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت، محبت اور الفت تھی اور اُن کی دقتِ نظر اور ان کی سخن فہمی کے ہمیشہ مداح رہے۔ فرماتے تھے کہ وہ جوہر کو خوب سمجھتے تھے اور بڑی نازک تنقید کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جاحظ کی کتاب البیان والتبیین جب نئی نئی چھپ کر آئی تو مجھے وہ بے ترتیب اور پراگندہ معلوم ہوئی۔ رات کو مولانا حالی آئے اور وہ کتاب مانگ کر لے گئے۔ صبح کو واپس کی تو فرمایا کہ 'یہ نثر کا حماسہ ہے'۔ مولانا [شبلی] کہتے تھے کہ اُن کے اس ایک فقرے نے کتاب کے موضوع کو میرے سامنے آئینہ کر دیا اور اُس کی ترتیب کا وہ پہلو میرے سامنے آیا، جو پہلے سامنے نہ تھا۔[۲۴]

جنوری ۱۸۹۴ء میں جب شبلی کو 'شمس العلما' کا خطاب ملا تو علی گڑھ کالج کی علمی مجلسوں نے ۱۹ر جنوری کو ان کے اعزاز میں ایک بڑا جلسہ ترتیب دیا، جس میں جملہ اکابرِ کالج نے شرکت کی، بالخصوص سر سید احمد خاں، سید محمود، نواب محسن الملک، نواب مزمل اللہ خاں، مسٹر بیک (پرنسپل کالج)، پروفیسر آرنلڈ، جسٹس سید کرامت حسین (پروفیسر)، خواجہ غلام الثقلین، مولانا ظفر علی خاں، مولوی بہادر علی، بعض طلبہ اور مولانا الطاف حسین حالی شامل تھے۔ دیگر اکابر کی طرف سے تہنیتی تقاریر کے علاوہ اس جلسے کی خاص بات مولانا حالی کا تیرہ اشعار پر مشتمل قصیدہ 'من الحبیب الی الحبیب' تھا، جو انھوں نے اس موقعے کے

لیے لکھا تھا۔ قصیدے کے اوّلین تین اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

یا وحیداً من الکرام فریداً
و عزیزاً کمثل علقٍ نفیس

[اے بڑے آدمیوں میں یکتا اور یگانہ اور نادر الوجود، مثل نفیس و نادر چیز کے]

انت اولی بان تُلَقَّبَ شمساً
بَل بانْ یَّجْعَلون شمس الشموس

[تُو اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ تجھ کو آفتاب کا لقب دیا جائے، بلکہ اس بات کا کہ تجھ کو آفتابوں کا آفتاب قرار دیا جائے]

انت شمسُ الھُدیٰ و لستَ بشمس
یعتریھا الخنوس بعد الخنوس

[تُو ہدایت کا آفتاب ہے اور وہ آفتاب نہیں، جس کو غروب پر غروب لاحق ہوتا ہے][۲۵]

اس قصیدے کا جواب شبلی نے یورپی خواتین و افسران اور رؤسا و طلبہ علی گڑھ کالج کی طرف سے اسٹریچی ہال میں ۱۷ر فروری ۱۸۹۴ء کو منعقدہ ایک عظیم الشان جلسے میں دیا، جس میں رسم خلعت اور عطائے خطاب سرکاری طور پر ادا کی گئی۔ اس موقع پر اپنے خطاب کے آخر میں شبلی نے کہا:

> عطائے خطاب کی تقریب میں اکثر بزرگانِ قوم نے مبارک بادی کے جو خطوط لکھے اور میرے رُتبہ اور حالت سے بہ درجہا بڑھ کر جن الفاظ میں قدر دانی کا اظہار کیا، ان کا اثر اگرچہ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میں 'ایاز قدر خود بشناس' کا مقولہ بھول جاتا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ وہ تحریریں میرے دائمی شرف و عزت کی باعث ہیں اور میں ان بزرگوں کا جس قدر شکریہ کروں، کم ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں اور آج بھی جہاں اسلامی حکومت ہے، وہاں کے حکومت کے عطا کردہ خطابات سے قومی خطابات کی عزت زیادہ کی جاتی ہے، اس لحاظ سے میری اس عزت افزائی کی نسبت ان بزرگانِ قوم کی طرف سے پسندیدگی اور خوشی کا اظہار، جو ہماری قوم کے جائز قائم مقام ہیں، بالخصوص لسان الملک، فخر قوم

اور مخدوم قوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی دام مجدہ کی نظم، جو جناب موصوف نے اس موقع پر لکھی ہے، میرے لیے تمغائے فخر اور سند عزت ہے۔ بے شبہ یہ وہ بڑی سے بڑی عزت ہے، جو مجھ کو حاصل ہو سکتی تھی اور جس کے حاصل ہونے پر مجھ کو اور کسی عزت کی خواہش نہیں ہو سکتی۔[26]

ایک طرف حالی کا خراج عقیدت تو دوسری جانب شبلی کی طرف سے حالی کی نظم کو تمغائے فخر اور سند عزت قرار دینے سے دونوں کے گہرے اور پُر خلوص تعلقات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ جب مولانا حالی کو 'شمس العلما' کا خطاب دیا گیا تو مولانا شبلی نے کہا کہ 'اب اس خطاب کی عزت بڑھ گئی ہے'۔[27]

۱۸۹۹ء میں شبلی کی علالت اس حد تک شدت اختیار کر گئی کہ انھیں زندگی کی امید نہ رہی۔ ایسے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو گونڈہ کے ایک اسسٹنٹ سرجن ڈاکٹر مصطفیٰ خاں کی اعظم گڑھ تعیناتی سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ 'انھوں نے عجیب گرم جوشی سے علاج کیا اور اس سے کچھ فائدہ بھی ہے'۔[28] پھر کچھ امید بندھی تو ۱۱ر جون ۱۸۹۹ء کو انھی کو لکھا کہ 'اگر خدا نے صحت کامل دی تو میں اپنے تمام خالص دوستوں کو مدعو کروں گا، جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیز الدین، میر ولایت حسین وغیرہ ہوں گے'۔[29] اسی سلسلے میں شبلی نے گیارہ اشعار پر مشتمل ایک نظم لکھی، جس کے آخری دو شعر ملاحظہ کیجیے:

مژدۂ صحتِ من ہاں برسانند کنوں
ہر کسے را کہ بمن دعوئ اخلاص و وفاست
می تواں گفت بہ مہدی و بہ حالی و عزیز
بہ شد آں بندہ کہ از حلقہ بگوشانِ شماست[30]

مرض سے نجات کے بعد مذکورہ بالا 'قصیدۂ کشمیریہ' تخلیق ہوا تو اس کی کاپیاں دوستوں کو بھی ارسال کیں۔ مولانا حالی کو بھی بھیجیں، جن کے جواب میں انھوں نے درج ذیل خط لکھا:

قصیدۂ کشمیریہ کی متعدد کاپیاں وصول ہوئیں۔ پہلے اس سے کہ آپ کے عطیے کا شکریہ ادا کروں، مجھ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، جس نے مدت دراز کے بعد

آپ کی صحت کا مژدہ آپ ہی کی زبان سے سنوایا۔ فی الواقع آپ کی حالت نازک ہو گئی تھی اور مرض کو حد سے زیادہ اشتداد ہو گیا تھا، باوجودیکہ آب و ہوا کی بہت ضرورت تھی، مگر آپ کو اس کا موقع نہیں ملا۔ اب درحقیقت صرف خدا کے فضل پر اور بحسب ظاہر شفیق و ہمدرد معالج پر صحت کا انحصار ہے۔ اذا اراد اللہ شیئاً ھیئا اسبابہ، ایسی حالت میں ڈاکٹر مصطفیٰ خاں صاحب کا اعظم گڑھ میں آنا صاف دلالت کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو ابھی آپ کی قومی خدمات کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رکھنا منظور تھا۔ فالحمد للہ ثم الحمد للہ علی ما انعم علینا ببقائکم و بنعمۃ وجوکم لدینا۔[31]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی، شبلی کی صحت و سلامتی کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں اور ان کی صحت یابی کی اطلاع پا کر اللہ کے حضور شکر ادا کرتے ہیں۔ حالی کے مذکورہ بالا خط میں سات اشعار پر مشتمل 'قطعہ در شکر صحت یابی شمس العلما مولانا شبلی نعمانی' درج کیا، جس کا پہلا شعر پیش کیا جاتا ہے:

للہ الحمد پس از ناخوشی و رنج دراز
شبلی ما بہ مراد از سر بالیں برخاست[32]

یہی نہیں، بلکہ انھیں شبلی کی فتوحات سے بھی خاص دلچسپی ہے، چنانچہ روم میں منعقدہ اورینٹل کانفرنس میں شبلی کی متوقع شرکت کے بارے میں استفسار کے ذریعے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہیں:

مسٹر آرنلڈ کی تحریر سے اور نیز آپ کے اعلان سے، جو چودھویں [صدی ؟] میں چھپا تھا، یہ معلوم ہوا تھا کہ اورینٹل کانفرنس میں، جو اس سال روم یا اٹلی میں ہونے والی ہے، آپ کا بھی ارادہ تشریف لے جانے کا ہے اور میں خیال کر رہا تھا کہ آپ روانہ ہو گئے ہوں گے مگر قصیدۂ مذکور کے وصول ہونے سے معلوم ہوا کہ ابھی آپ اعظم گڑھ میں تشریف رکھتے ہیں۔ مجھے تاریخ روانگی ٹھیک طور پر یاد نہیں رہی۔ معلوم نہیں کہ ارادہ فسخ ہو گیا یا تاریخ معین ابھی نہیں آئی۔[33]

اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ کالج کے حالات سے دونوں کو دلچسپی تھی، چنانچہ

جب کالج کے حالات زیادہ ہی ابتر ہو گئے تو شبلی کی طرح حالی بھی پریشان رہنے لگے:

> مسٹر بیک کے مرنے کا قبل از وقت ایسا افسوس ہوا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ سید محمود کی بے اعتدالیاں اب حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور لوگوں کو اُن کی آڑ میں کالج کو درہم برہم کرنے کا خاصا موقع مل گیا ہے۔ مَیں نے سنا ہے کہ محسن الملک کو نواب لفٹنٹ گورنر نے نینی تال پر بلایا ہے۔ سید محمود پریزیڈنٹی سے علیحدہ کرنا نہایت ضرور ہے۔ کاش! ہز آنر اُن کے برطرف کرنے کا مشورہ دیں۔ مسٹر ماریسن کو مسٹر بیک کی جگہ پرنسپلی پر ولایت سے بلایا گیا ہے، مگر معلوم نہیں کہ انھوں نے تار کا کیا جواب دیا؟ دو نئے پروفیسر ولایت سے اَور بلائے ہیں۔ سر دست کالج کی حالت نہایت نازک ہے۔ خدا انجام خیر کرے۔[44]

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا یہ کہنا بجا ہے کہ شبلی کے علی گڑھ سے ترکِ تعلق کے بعد وہاں کے نازک حالات کا مولانا حالی نے ان سے جس انداز میں ذکر کیا ہے، وہ دونوں کے ذہنی اشتراک کا بھی پتا دیتا ہے۔[45]

۱۷ رمئی ۱۹۰۷ء کے روز اتفاقیہ بندوق چل جانے سے شبلی کے گزیدِ پا کا واقعہ پیش آیا۔ اخبارات کے ذریعے یہ اطلاع ان کے تلامذہ، معتقدین اور احباب تک پہنچی تو ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ ایسے میں بہت سے عیادت کو آئے، بعض نے خطوط لکھ کر خیریت معلوم کی۔ حالی بھی شبلی کے ایک پاؤں کے ضائع ہو جانے پر افسردہ تھے اور ان کی عیادت کے لیے بھی بے قرار، لیکن ایک تو اُن دنوں حالی نے آنکھ بنوائی ہوئی تھی اور ڈاکٹروں نے انھیں لکھنے پڑھنے سے بالکل منع کر دیا تھا، دوسرے کبر سنی، چنانچہ وہ فوری طور پر اعظم گڑھ تک کا سفر نہ کر سکے۔ ایسے میں ان کے صاحب زادے حامد حسن نعمانی کے نام ایک خط میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

> آج تک جو کچھ اخبارات کے حوالے سے جناب مولانا [شبلی] کے حالات سنے گئے ہیں، ان سے کچھ تشفی نہیں ہوئی، اس لیے ناچار آپ [حامد حسن نعمانی] کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ میرا یہ خط مولانا کو دکھا کر اور جو کچھ وہ اپنا حال لکھوائیں، اس کو قلم بند کر کے ازراہِ لطف میرے پاس بھیج دیں، نیز یہ بھی [کذا] لکھیں کہ بمبئی ڈاکٹر رجب علی، جو مولانا کو وہاں سے بلاتے ہیں، وہاں جانے کا ارادہ ہے یا نہیں۔ ...... مولانا کے دیکھنے کو اعظم گڑھ آنے کا بھی قصد ہے، مگر اَب تک ایسے موانع پیش آتے رہے کہ یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکا۔ اگر لکھنؤ آنا ہوا تو اعظم گڑھ آنے سے پہلے آپ کو اطلاع دوں گا۔ مولانا کی خدمت میں بعد حسرت دیدار و اشتیاقِ زیارت سلام و نیاز کہہ دیجیے گا۔[46]

شبلی کی زندگی کا یہ حادثہ ایک طرف ایک المیے کا باعث بنا تو دوسری جانب اس واقعے کی کئی ایک شاعرانہ توجیہات بھی سامنے آئی۔ شبلی کے تلامذہ اور بعض احباب نے اس سانحے پر رباعیات و قطعات لکھے، جو سید سلیمان ندوی کے سپرد کر دیے گئے، جنھوں نے یہ تمام شعری کاوشیں الندوہ کے دو شماروں (ستمبر اور اکتوبر) میں شائع کر دی۔ ان رباعیات کو دیکھ کر مولانا حالی نے بھی ایک رباعی کہی اور منیجر الندوہ کو بھیج دی۔ حالی نے لکھا:

> رسالہ الندوہ میں مولانا شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھ کر مجھے بھی یہ خیال ہوا کہ ان کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کروں، لہٰذا ذیل کے چار مصرعے موزوں کر کے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں، الندوہ کے کسی آئندہ نمبر میں ان کو بھی درج فرما دیجیے گا:

شبلی کہ گزندِ پاش بر دل شکن است
باخستگیش خجستگی مقترن است
چنداں کہ بکاہند فزایند اینجا
کاراستن چمن ز پیراستن است[47]

حالی کے ان جذبات پر شبلی نے الندوہ کے شمارہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں 'مولانا حالی کی ذرہ نوازی' کے عنوان سے ایک مختصر سا شذرہ لکھا، جس میں حالی کے مذکورہ خط اور رباعی کے اندراج کے بعد ان الفاظ میں اپنی نیازمندی کا اظہار کیا:

> مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرہ نوازی ہے۔ وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا فرماتے ہیں، لیکن میری عزت یہ

> ہے کہ مجھ کو اپنے نیاز مندوں کے زمرے میں شامل ہونے کی اجازت دیں۔
> اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں، جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی
> ہے، خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے، آمین۔[۳۸]

۱۹۰۸ء میں شبلی کی فارسی نظموں کا مجموعہ دستۂ گل شائع ہوا تو حالی کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ یہ وہ مجموعہ ہے، جس میں عطیہ سے متعلق 'زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے تھے۔'[۳۹] جب یہ مجموعہ حالی کے مطالعے میں آیا تو وہ پکار اُٹھے:

> کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اُس شخص کا کلام ہے، جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے، جس کے نشے میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی و بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دل ربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔[۴۰]

حالی نے اس مجموعہ کلام پر شبلی کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ 'میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم و نثر، جو کچھ ہے، اس کو بھی چھپوا کر شائع کر دوں، مگر دستۂ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں...... و لیس فی ذلک شائبۃ من التصنع۔'[۴۱]

۱۹۰۹ء میں شبلی کا دوسرا مجموعہ کلام بوئے گل شائع ہوا، جس کے بارے میں خود شبلی کو خود احساس تھا کہ بالکل پھیکا ہے۔[۴۲] شبلی کے مطابق:

> بوئے گل کی نسبت تمام اہل نظر کی رائے ہے کہ دستۂ گل اور اس میں جذب و سلوک کا فرق ہے۔ واقعی دونوں کے شان نزول اسی قدر مختلف ہیں، جس قدر دونوں کے جوش و سرمستی میں فرق ہے۔ لیکن مولانا حالی سب سے مختلف الرائے ہیں۔ وہ بوئے گل کو حال بتاتے ہیں اور دستۂ گل کو قال۔[۴۳]

مذکورہ بالا تمام بحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حیات جاوید پر چند جملوں کے علاوہ شبلی

کے زبان و قلم سے حالی سے متعلق شاید ہی کوئی ناگوار جملہ ادا ہوا ہو۔ رہی بات حیات جاوید پر اعتراض کی تو بقول سید سلیمان ندوی، 'یہ مولانا حالی کی ذات پر نہیں، جن کی وہ بے حد قدر کرتے تھے، بلکہ سرسید کے ناتمام بائیگرفی (سوانح عمری) پر اظہار خیال ہے'۔ سید صاحب کے خیال میں، 'اگر حیات جاوید کا مصنف مولانا کا کوئی عزیز بھی ہوتا، تب بھی وہ اس تصنیف کے متعلق اسی قسم کی رائے قائم کرتے'۔[۴۴] وجہ محض یہ تھی کہ شبلی سرسید کے دور آخر کی پالیسیوں سے متفق نہ تھے۔ سرسید سے اختلاف کرنے والوں میں ڈپٹی نذیر احمد بھی شامل تھے، جن کے معروف ناول ابن الوقت کو سرسید کا خاکہ قرار دیا جاتا ہے اور سرسید سے اختلاف تو حالی کو بھی تھا، اس امر کی تصدیق آل احمد سرور بھی کرتے ہیں:

> حالی بھی ایک زمانے میں حیات جاوید لکھنے کا ارادہ ترک کر چکے تھے اور سرسید کے مرنے سے کچھ پہلے، پیسہ اخبار میں ان کا، وقار الملک اور محسن الملک کا ایک بیان سرسید کے خلاف نکلنے والا تھا کہ ان کی وفات کی خبر نے قدرتی طور پر اسے روک دیا۔[۴۵]

سرسید سے حالی کے درج بالا اختلاف کے بعد شبلی و حالی کی 'معاصرانہ چشمک' میں کچھ حقیقت نہیں رہتی، بلکہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دونوں بزرگوں کے درمیان احترام کا رشتہ زندگی بھر قائم رہا اور وہ ایک دوسرے کے علمی کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔

۱۔ مہدی افادی: افادات مہدی، مرتبہ بیگم مہدی، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۳۹ء، طبع سوم، ص ۳۱۶-۳۲۲
۲۔ ایضاً، ص ۳۲۳
۳۔ ایضاً، ص ۳۲۸
۴۔ ایضاً، ص ۳۳۲
۵۔ آل احمد سرور: مقدمہ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، مصنفہ عبداللطیف اعظمی، دہلی، شبلی اکادمی، ۱۹۴۵ء، ص ج-د
۶۔ عبداللطیف اعظمی: مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ص ۵۵
۷۔ مولوی عبدالحق بنام عبداللطیف اعظمی، مرقومہ ۹ جولائی ۱۹۶۰ء، مطبوعہ ادیب علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۳
۸۔ شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۴ء، ص ۲۳۶

۹۔ مولانا حالی بنام شبلی نعمانی، مرقومہ ۱۸ ستمبر ۱۸۹۹ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، اعظم گڑھ: ادبی دائرہ، ۲۰۱۳ء، ص ۳۲-۳۶
۱۰۔ مولانا حالی بنام مولوی عبدالحق، مشمولہ مکتوبات حالی اول، مرتبہ خواجہ سجاد حسین، پانی پت: حالی پریس، ۱۹۲۵ء، ص ۳۲
۱۱۔ مولوی عبدالحق بنام عبداللطیف اعظمی بحولہ بالا ۷
۱۲۔ شبلی نعمانی بنام نواب محسن الملک، مرقومہ ۱۹ اپریل ۱۹۰۳ء، مشمولہ مکتوبات شبلی مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، اعظم گڑھ: ادبی دائرہ، ۲۰۱۲ء، ص ۳۳
۱۳۔ شبلی نعمانی بنام مولوی محمد سمیع، مرقومہ ۱۰ مارچ ۱۸۸۶ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۱۶ء، ص ۷۹
۱۴۔ شبلی نعمانی: شعرالعجم دوم، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ص ۲۵
۱۵۔ شبلی نعمانی بنام شیخ رشید الدین انصاری، ۲۹ اگست ۱۹۰۷ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۳۱۸
۱۶۔ مولوی عبدالحق بنام عبداللطیف اعظمی بحولہ بالا ۷
۱۷۔ شبلی نعمانی بنام حبیب الرحمٰن شروانی، مرقومہ ۱۹ جنوری ۱۹۰۲ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۳۱، ۱۳۲
۱۸۔ شبلی نعمانی بنام حبیب الرحمٰن شروانی، مرقومہ ۷ اگست ۱۹۰۰ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۳۲
۱۹۔ شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی، ص ۲۳۶-۲۳۷
۲۰۔ آل احمد سرور: تنقیدی اشارے، لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۵ء
۲۱۔ مہدی افادی: افادات مہدی بحولہ بالا ۱۱، ص ۳۳۰
۲۲۔ ایضاً، ص ۳۳۳
۲۳۔ شبلی نعمانی بحوالہ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۴۳ء، ص ۸۰۲
۲۴۔ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۸۰۱
۲۵۔ مولانا حالی بحوالہ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۲۵۳-۲۵۴۔ مکمل قصیدے کے لیے رجوع کیجیے ——
مولانا حالی: کلیات نظم حالی دوم، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء، ص ۴۳۰-۴۳۱
۲۶۔ شبلی نعمانی بحوالہ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۲۶۴
۲۷۔ مولوی عبدالحق بنام عبداللطیف اعظمی بحولہ بالا ۷
۲۸۔ شبلی نعمانی بنام حبیب الرحمٰن شروانی، مرقومہ ۱۸۹۹ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۲۰
۲۹۔ شبلی نعمانی بنام حبیب الرحمٰن شروانی، مرقومہ ۱۸ جون ۱۸۹۹ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۲۱
۳۰۔ شبلی نعمانی: کلیات شبلی فارسی مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۰۵ء، ص ۲۹

۳۱۔ مولانا حالی بنام شبلی نعمانی، مرقومہ ۱۸ ستمبر ۱۸۹۹ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ۲۰۱۳ء، ص ۳۲
۳۲۔ مکمل قطعے کے لیے رجوع کیجیے..... مولانا حالی: کلیات نظم حالی دوم، ۳۱۸-۳۱۹
۳۳۔ ایضاً، ص ۴۳
۳۴۔ ایضاً، ص ۴۳
۳۵۔ ڈاکٹر محمد الیاس: علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ص ۴۳
۳۶۔ مولانا حالی بنام حامد حسن نعمانی، مرقومہ ۱۹۰۷ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ص ۱۵۲-۱۵۳
۳۷۔ مولانا حالی بنام مینیجر الندوہ، مشمولہ مقالات شبلی ہشتم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ص ۱۹۲۔ رباعی کے لیے رجوع کیجیے..... مولانا حالی: کلیات نظم حالی دوم، ص ۳۷۷
۳۸۔ شبلی نعمانی: مقالات شبلی ہشتم، ص ۱۹۲
۳۹۔ شبلی نعمانی بنام زہرا فیضی، مرقومہ ۲ مئی ۱۹۰۸ء، مشمولہ خطوط شبلی، بھوپال: عمل السلطان بک ایجنسی، ص ۹۲
۴۰۔ مولانا حالی بنام شبلی نعمانی، مرقومہ ۱۹۰۸ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ص ۳۶
۴۱۔ ایضاً، ۳۶-۳۷
۴۲۔ شبلی نعمانی بنام ابوالکلام آزاد، مرقومہ ۱۵ جون ۱۹۰۹ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ص ۲۵۱
۴۳۔ شبلی نعمانی بنام مہدی حسن افادی، مرقومہ ۸ مئی ۱۹۰۹ء، مشمولہ مکاتیب شبلی دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۱۷ء، ص ۲۵۲
۴۴۔ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۸۰۷-۸۰۸
۴۵۔ آل احمد سرور: مقدمہ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ص ۹

□□□

علامہ شبلی نعمانی بنام سرسید احمد خاں

علامہ شبلی نعمانی کے خطوط کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ اٹھانوے مکتوب الیہم کے نام ان کے ایک ہزار سے زائد مکاتیب میں سے سرسید کے نام محض سولہ دستیاب خطوط کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور نہ ہی ان سے شبلی کے نظریات یا اسلوب پر بحیثیت مجموعی بات ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ شبلی و سرسید اپنے وقت کے دو عبقری تھے، اس لیے ان کی خط کتابت سے اُس عہد کے خیالات، موضوعات اور انداز فکر و نظر پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے۔

شبلی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے، جب جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سرسید آئین اکبری کی تدوین سے اسباب بغاوت ہند کی طرف قدم بڑھا رہے تھے اور پھر جب شبلی نے پچیس برس کی عمر میں علی گڑھ میں قدم رکھا تو ہندوستانی دانش سرسید کی جلائی ہوئی مشعل کی روشنی میں اپنا سفر طے کرنے پر مجبور ہو چکی تھی۔ ۱۸۸۳ء سے علی گڑھ میں دونوں بظاہر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ذہنی و نظریاتی طور پر بتدریج دُور ہوتے گئے اور اختلافات کی خلیج بڑھتی رہی، حتیٰ کہ شبلی کو سرسید پر براہ راست تنقید کی ضرورت محسوس ہوئی۔

سرسید احمد خاں کے نام علامہ شبلی کے سولہ دستیاب خطوں میں سے پہلا خط بغیر تاریخ کے ہے، لیکن اس پر سرسید احمد خاں نے ۴ر جنوری ۱۸۷۹ء کو ایک نوٹ لکھا تھا، جب کہ آخری معلومہ خط ۱۲ر ستمبر ۱۸۹۵ء کا تحریر کردہ ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۴ر جنوری ۱۸۷۹ء کو لکھا گیا شبلی کا خط سرسید کے نام اوّلین خط نہیں ہے، کیونکہ اس میں شبلی

نے کچھ روز پہلے لکھے گئے ایک خط کا ذکر کیا ہے۔ بہر حال دستیاب خطوں کے مطابق اس خط کتابت کا دورانیہ جنوری ۱۸۷۹ء سے ۱۲ر ستمبر ۱۸۹۵ء تک، یعنی کم و بیش سترہ برسوں پر محیط ہے۔ ذیل میں ان دستیاب خطوں کی تفصیل درج کی جاتی ہے، ساتھ ہی ان خطوں کے ماخذ بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ جن خطوں میں مقام تحریر درج نہیں وہاں 'م ن'، یعنی مقام ندارد لکھ دیا گیا ہے، البتہ جن مکتوبات سے اندرونی شہادت ملی، وہاں مقام تحریر کے بعد سوالیہ نشان دے دیا گیا ہے:

الہ آباد، ت ن، مکتوبات شبلی
مقام نامعلوم، ۴ر مئی ۱۸۸۳ء، مکتوبات شبلی
مقام نامعلوم، ۱۹ر دسمبر ۱۸۸۳ء، مکتوبات شبلی
مقام نامعلوم، ۱۵ر جون ۱۸۸۴ء، مکتوبات شبلی
مقام نامعلوم، ۸ر اگست ۱۸۸۴ء، مکتوبات شبلی
مقام نامعلوم، ۲۴ر اپریل ۱۸۸۵ء، مکتوبات شبلی
مقام نامعلوم، ۱۴ر جون ۱۸۸۶ء، مکتوبات شبلی
اعظم گڑھ؟، یکم جون ۱۸۹۰ء، مکتوبات شبلی
مقام نامعلوم، ۲ر دسمبر ۱۸۹۱ء، مکتوبات شبلی
عدن؟، روز شنبہ ۸ر مئی ۱۸۹۲ء، مکتوبات شبلی
قسطنطنیہ، ۲۵ر مئی ۱۸۹۲ء، مکاتیب شبلی اوّل
باب عالی، ۱۵ر جون ۱۸۹۲ء، مکاتیب شبلی اوّل
مقام نامعلوم، ۵ر محرم الحرام ۱۳۱۰ھ، مکتوبات شبلی
مقام نامعلوم، ۲۰ر جنوری ۱۸۹۵ء، مکتوبات شبلی
مقام نامعلوم، ۲۲ر جنوری ۱۸۹۵ء، مکتوبات شبلی
اعظم گڑھ، ۱۲ر ستمبر ۱۸۹۵ء، مکاتیب شبلی اوّل

علامہ شبلی نے سرسید احمد خاں کو ہمیشہ نہایت ادب و احترام سے مخاطب کیا، مثلاً 'حضرت بندہ'، 'بحضور اقدس'، 'بحضرت اقدس'، 'حضرت اقدس'، 'حضرت سید اقدس'،

'سیدی وسیدے'، 'سیدی'، 'جناب آنریبل سید احمد خاں صاحب'، 'قبلہ ام'، 'سیدنا ومولانا'، 'سیدی ومولائی'، 'مطاعی'۔ سلام وآداب کا بالخصوص التزام نہیں کرتے، البتہ کسی کسی خط میں 'تسلیم'، ''ادام اللہ بقاءہ''، 'دام فضلکم'، 'القابکم اللہ' جیسے الفاظ مل جاتے ہیں۔

شبلی خطوں کا اختتامیہ مختلف انداز میں کرتے ہیں۔ بالعموم تو وہ اپنا نام 'شبلی نعمانی' لکھتے تھے؛ لیکن کبھی 'محمد شبلی'، کبھی 'محمد شبلی نعمانی' اور بعض اوقات صرف 'شبلی' لکھتے تھے، البتہ ایک خط میں نام سے پہلے 'خادم' اور ایک دوسرے خط میں 'خادم قدیم' کے الفاظ بڑھائے۔ سرسید کے نام اوّلین خط میں شبلی نے اپنا پورا پتا 'از الٰہ آباد، محلہ کرنیل گنج، مکان بابو ہری موہن داس صاحب' درج کیا۔ اسی طرح ۲۵ رمئی ۱۸۹۲ء کے ایک خط پر بھی انھوں نے اپنا پورا پتا تحریر کیا۔

شبلی تاریخِ تحریر یا مقامِ تحریر کا التزام باقاعدگی سے نہیں کرتے۔ زمانۂ تحریر اکثر درج کرتے ہیں، جس کی ترتیب تاریخ، ماہ اور سال ہوتی ہے۔ کسی مہینے کی پہلی تاریخ کو 'یکم' کے بجائے '۱' سے ظاہر کرتے ہیں، مثلاً '۱رجون ۱۸۹۰ء'۔ ایک خط پر دن بھی تحریر کیا ہے، یعنی 'روز شنبہ ۸رمئی ۱۸۹۲ء'۔ تاریخِ تحریر کے سلسلے میں ایک خط میں انھوں نے ہجری تقویم سے بھی کام لیا ہے، یعنی '۵رمحرم ۱۳۱۰ھ'۔ مقامِ تحریر کے حوالے سے وہ اکثر تساہل سے کام لیتے ہیں، چنانچہ سرسید کے نام بارہ خطوں میں اس سے اغماض برتا گیا ہے۔

سرسید کے نام شبلی کے محض تین خط مفصل کہلا سکتے ہیں، باقی تمام خطوط مختصر تحریریں، یعنی رقعات کی ذیل میں آتے ہیں، حتیٰ کہ چند مکاتیب میں تو مکتوب نگار نے فقط دو تین جملوں پر اکتفا کیا ہے۔

پہلا خط ایک بائیس سالہ نوجوان کا ایک معروف شخصیت سے تخاطب ظاہر کرتا ہے۔ یہ خط ایک ضرورت کے پیشِ نظر لکھا گیا، اس لیے اس کے اسلوب میں تعلقِ خاطر کی جگہ ایک تکلف پایا جاتا ہے۔ شبلی لکھتے ہیں:

> اس سے کچھ روز پہلے ایک خط بغرض دریافت قیمت تہذیب الاخلاق ارسال کیا

> تھا، لیکن اب تک جواب سے مشرف نہ ہوا۔ غالباً وہ خط بھی نہیں پہنچا، ورنہ منفرداً ومشترکاً سے بہت جلد مطلع فرمایئے گا۔ خطبات احمدیہ کی کیا قیمت ہوگی اور آیا آپ غریب طالب علموں کے لیے کچھ کمی ہے یا نہیں۔ اردو خطبات احمدیہ (اگر جداگانہ مطبوع ہوئی ہو) کی بھی قیمت سے بھی آگاہ فرمایئے گا۔ سنین اسلام کی دوسری جلد ہو تو مطلع کیجیے۔ ٹکٹ آدھ آنہ کا ارسال ہے۔ امید کہ جلد تر جواب لکھیں گے[۲۲]

جنوری ۱۸۸۳ء کے اواخر میں علی گڑھ کالج میں مشرقی زبانوں کے معلم کی ضرورت ہوئی تو اسسٹنٹ عربک پروفیسر کی حیثیت سے شبلی کا تقرر عمل میں آیا۔ سرسید پر شبلی کی صلاحیتیں ظاہر ہوگئی تھیں، چنانچہ وہ کئی معاملات میں شبلی کی رائے کو اہمیت دینے لگے تھے۔ پروفیسر اصغر عباس نے اپنے ایک مضمون 'بعض مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط' میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ '۱۸۸۳ء میں مدرسۃ العلوم کے بیرونی دروازے پر کتبہ لگانا تجویز ہوا تھا۔ اس سلسلے میں جو اشعار کندہ ہونے تجویز ہوئے تھے، انھیں سرسید نے شبلی کے پاس بغرضِ اصلاح بھیجا تھا'[۲۳] شبلی موصولہ اشعار کے بارے میں اپنے عجز کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جو خدمت مرحمت ہوئی، وہ میری وقعت کے حد سے زیادہ ہے، مگر امتثالاً للامر عرض ہے، اشعار مرسلہ غالباً بحرِ ہزج مسدس میں لکھے گئے ہیں اور اس میں صرف دو زحاف قصر وحذف واقع ہوتے ہیں، مگر تین پہلے مصرعوں کا وزن درست نہیں یا شاید مجھی کو غلطی ہوئی ہے۔ جو تغیر اس میں کیا گیا ہے، وہ اس وجہ سے ضروری تھا کہ صنعت اقتباس محفوظ رہے اور اس لحاظ سے ایک شعر اَور مزید [کذا] کہا گیا ہے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ میں اپنی خدمت کو پوری طرح سے ادا نہیں کر سکا، مگر میری وسعت میں اسی قدر تھا[۲۴]

سرسید نے علامہ عنایت رسول چریا کوٹی سے عبرانی زبان کا درس لیا تھا، جب کہ شبلی علامہ عنایت رسول کے بھائی مولوی محمد فاروق چریا کوٹی سے فیض یافتہ تھے۔ سرسید، شبلی کے

استاد مولوی محمد فاروق چریاکوٹی کے علم و فضل کے پیشِ نظر انھیں علی گڑھ لانے کے متمنی تھے، چنانچہ انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو شبلی نے لکھا:

> مولوی صاحب موصوف وہاں کے قیام کو پسند فرماتے ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ بہ مجموعہ اس پایے کا شخص اس قلیل مشاہرہ پر بمشکل ہاتھ آسکتا ہے۔ اگر ارشاد ہو تو میں ان کو ساتھ لے آؤں۔[۵]

اگرچہ شبلی نے 'قلیل مشاہرہ' کو ان کے علی گڑھ آنے میں رکاوٹ قرار دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سرسید کے نظریات کو ناپسند کرتے تھے۔ علی گڑھ سے اختلافات میں وہ اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ مسدسِ حالی کے جواب میں مسدسِ حوالی لکھ ڈالا۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے خیال میں، شبلی انھیں علی گڑھ کالج سے وابستہ کرنے کے خواہش مند تھے، مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔[۶]

الفاروق لکھنے کے لیے شبلی کو جن کتابوں کی ضرورت تھی، وہ ہندوستان میں بالعموم دستیاب نہ تھیں، چنانچہ شبلی مطلوبہ کتب کے لیے بے چین رہتے اور مصر و روم و شام کے کتب خانوں سے استفادے کی تدبیریں سوچتے رہتے۔ بالآخر انھیں ۱۸۹۲ء میں اس سیاحت کا موقع ملا۔ ۲۶رمئی کو وہ علی گڑھ سے چل پڑے اور براستہ بمبئی بحری جہاز کے ذریعے اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ بمبئی سے انھوں نے سرسید کے نام ایک خط لکھا، جو دستیاب نہیں ہو سکا، البتہ ۸رمئی کو عدن سے لکھا گیا خط علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں شائع ہونے کی وجہ سے محفوظ رہ گیا۔ اس میں شبلی نے اپنی ناسازیِ صحت اور سفر کی صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> جہاز کی حرکت اور دورانِ سر کی وجہ سے مفصل حالات کے لکھنے سے معذوری ہے۔ یہ خط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ دو دن تک سخت تکلیف رہی، میں نیم مردہ پڑا رہا۔ اب اچھا ہوں، لیکن جہاز کی تعفن اور جنبش سے کسی وقت طبیعت بحال نہیں ہوتی۔ کھانا نہایت عمدہ ملتا ہے۔ اکثر ڈش نہایت خوش مزہ ہوتے ہیں۔ کیا لکھوں، لکھا نہیں جاتا۔[۷]

۲۲رمئی ۱۸۹۲ء کو شبلی قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ یہ سیاحت خالصتاً کتب بینی کے لیے تھی، چنانچہ شبلی کی پہلی ترجیح کتب خانوں کا دورہ اور دستیاب کتب سے استفادہ رہی۔ اس حوالے سے وہ خطوں کے ذریعے سرسید کو مسلسل مطلع کرتے رہے:

> کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں، لیکن کہاں تک لکھوائی جا سکتی ہیں۔ امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں اور بوعلی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں۔ امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں۔ خیر، جو ممکن ہوگا، کیا جائے گا۔ ...... یہاں آج کل عینی کی شرح بخاری چھپ رہی ہے، ۹رجلدیں چھپ چکی ہیں۔ بہت بڑی کتاب ہے۔ ...... بیروت کے علما نے تمام نصارائے عرب، خواہ وہ جاہلیت کے ہوں، خواہ اسلام کے، ان سب کے اشعار کا ایک مجموعہ تیار کر کے چھاپنا شروع کیا ہے۔ ایک جلد چھپ چکی ہے، اسی میں اخطل کا دیوان بھی ہے، لیکن وہ مستقل تین جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ یہ آج تک کہیں نہیں مل سکا تھا، یورپ میں بھی اس کی تلاش تھی۔[۸]

> قلمی کتابیں یہاں [برائے فروخت] نہیں ملیں، مصر میں کبھی کبھی ہاتھ آ جاتی ہیں، اس لیے صرف مطبوع کتابیں خریدی جا سکتی ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی متعدبہ ہے۔ ...... ارسطو وغیرہ کی کتابوں کے اصلی ترجمے نہایت قدیم خط میں موجود ہیں، لیکن کیا حاصل؟ کتابت کی شرح ۴ روپے جز سے کسی حال میں کم نہیں۔ ...... عبدالقاہر جرجانی کی تفسیر ہے، مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں۔[۹]

واضح رہے کہ ۲۵رمئی اور ۱۵رجون کے خطوں میں شبلی نے اس بات کا بالخصوص ذکر کیا ہے کہ یہاں معتزلہ کے بارے میں کتب دستیاب نہیں ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک 'نعمانی' کو معتزلہ سے متعلق کتب کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا وہ سرسید کی خواہش پر ان کی تلاش میں سرگرداں تھے یا خود انھیں اس نظریے سے دلچسپی ہو گئی تھی؟ اتنا ضرور ہے کہ بعد میں شبلی نے 'المعتزلہ والاعتزال' کے نام سے ایک مضمون ضرور لکھا، جو تہذیب الاخلاق کے شمارے

جولائی ۱۸۹۵ء شائع ہوا، البتہ اتنی احتیاط کی کہ اس پر 'شبلی نعمانی' کے بجائے 'اسدی الاعظمی' کا قلمی نام اختیار کیا۔[۱۰] اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید انھیں یہ مضمون اپنی مرضی کے برخلاف یا کسی [سرسید؟] کے اصرار پر لکھنا پڑا اور پھر یہ کہ اس نامکمل مضمون کی طرف انھوں نے کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ اس مضمون میں شبلی نے معتزلہ کے لیے توصیفی انداز اپنایا تھا، اس لیے سید عبدالحی حسنی نے علامہ شبلی کو معتزلی قرار دے دیا۔[۱۱] اگرچہ سیرۃ النعمان (۱۸۹۳ء)، الغزالی (۱۹۰۲ء)، علم الکلام (۱۹۰۳ء)، الکلام (۱۹۰۴ء) اور سوانح مولانا روم (۱۹۰۶ء) میں ان کا اندازِ نظر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے، لیکن سید سلیمان ندوی نے شبلی کے ہاں عقل و نقل کی تطبیق کو سرسید کی صحبت کا اثر قرار دیتے ہوئے اس بات کی پُرزور تردید کی کہ شبلی معتزلی بن گئے تھے۔[۱۲] چنانچہ اغلب یہی ہے کہ وہ سرسید کی خواہش کے احترام میں ان کتب کے متلاشی ہوئے، ورنہ سرسید کے نام خطوط میں ان کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

قسطنطنیہ میں انھیں زبان کی اجنبیت کی وجہ سے بہت دِقت ہوئی، چنانچہ انھوں نے سرسید کو مطلع کیا کہ 'مَیں نے ترکی پڑھنی شروع کی ہے اور اِن شاء اللہ کچھ نہ کچھ بقدرِ ضرورت واپسی کے وقت تک سیکھ لوں گا'۔[۱۳] دوسری مشکل، جو انھیں درپیش تھی، وہ یہ کہ 'ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے۔ بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دُور دُور ہیں'۔[۱۴]

اس سفر میں شبلی کی تخلیقی سرگرمیاں برابر جاری رہیں۔ سرسید کو مطلع کرتے ہیں کہ 'حالاتِ سفر میں ایک قصیدہ موزوں ہو گیا ہے، وہ خط کے ساتھ شامل ہے، مطبع مفید عام میں چھاپ کر علی گڑھ [انسٹیٹیوٹ] گزٹ کے ساتھ شائع کر دیا جائے تو مناسب ہوگا'۔[۱۵] یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ 'مَیں نے ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی، جو ناتمام رہ گئی: ستر بہتر شعر تک نوبت پہنچی تھی، پھر طبیعت رُک گئی'۔[۱۶] ساتھ ہی ساتھ وہ علی گڑھ کالج کو بھی نہیں بھولے۔ شبلی نے وہاں کے ایک فارسی اخبار اختر، جو دو ہزار کی تعداد میں چھپتا تھا، سرسید کے نام جاری کرا دیا اور انھیں لکھا:

> اس اخبار میں ہمارے کالج کے حالات چھپتے رہیں اور وہ ضرور کچھ نہ کچھ فائدہ

> دیں گے۔ یہاں اکثر لوگ ہندوستان کے نام سے بھی واقف نہیں، ورنہ اگر مسلمانوں کے تمام حالات اور ضرورتیں معلوم ہوں تو کالج کو مدد ملنا یقیناً مشکل نہیں۔ ہزاروں میل تک یہاں کے اوقاف کا فائدہ پہنچتا ہے۔[۱۷]

> یہاں کا ٹائپ بے انتہا عمدہ ہے۔ تمام دنیا میں اس کا نظیر نہیں۔ علی گڑھ [انسٹیٹیوٹ] گزٹ کے لیے یا مستقل مطبع کے لیے ضرور خریدنا چاہیے۔ بیروت و ہالینڈ کے حروف میں بھی یہ نوک پلک نہیں۔[۱۸]

> مَیں نے کالج کا نتیجہ اکمل الاخبار میں دیکھا اور بے انتہا خوش ہوا، بلکہ سچ یہ ہے کہ اسی عالم میں خط لکھنے بیٹھ گیا، ورنہ معمولی باتیں تو روز روز کیا لکھوں۔[۱۹]

> مَیں چاہتا ہوں کہ کالج کے لیے چند ترکی زبان کی عمدہ کتابیں خریدی جائیں، جن سے یہاں کی علمی ترقی کا اندازہ ہو سکے گا۔[۲۰]

شبلی اس سے پہلے بھی سرسید کو اپنے گھریلو حالات سے آگاہ کرتے رہتے تھے، مثلاً کیم جون ۱۸۹۰ء کے خط میں شبلی نے اپنی اہلیہ کی ناسازیِ طبیعت کے تسلسل کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اپنے دادا حسن علی کی رحلت سے مطلع کیا۔ لکھتے ہیں:

> افسوس کہ جناب جدِ امجد نے بیاسی برس کی عمر میں، تین چار دن ہوئے، انتقال کیا۔ اگرچہ ان کی عمر پوری ہو چکی تھی، لیکن چونکہ ان کی موت ناگہانی طور پر ایک صدمے سے ہوئی، اس لیے لوگوں کو نہایت رنج ہوا۔ ان کے تمام قویٰ درست تھے۔ مَیں نے رسالہ حسن [حیدر آباد] ان کو دیا تھا تو بغیر عینک کے پڑھ گئے۔ خدا مغفرت کرے۔[۲۱]

اب کی دیارِ غیر میں بھی وہ سرسید کے نام اپنے خطوں میں اپنے والد اور افرادِ خاندان کو یاد کرتے ہیں۔ ۲۵ مئی کو لکھتے ہیں کہ 'یہ خط والد قبلہ کو بھیج دیا جائے یا اس کی نقل۔ متعدد خطوط لکھنے کی فرصت نہیں'۔[۲۲] ۱۵ جون کو تحریر کرتے ہیں کہ 'یہ خط والد قبلہ کے پاس بھیج دیا جائے، میاں حمید کو تاکید فرمایئے کہ مجھ کو نہایت مفصل خط لکھیں اور عزیزوں کے امتحانات کے نتیجے بھی لکھیں'۔[۲۳] اور ۵ محرم کے خط میں اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہیں کہ مَیں نے والد قبلہ کو دو

خط لکھے، لیکن وہاں سے کوئی تحریر نہیں آئی، تردد ہے۔ آپ نے بھی کچھ تذکرہ نہیں فرمایا، خدا سے امید ہے کہ سب طرح سے خیریت ہوگی۔[24] اسی خط میں انھوں نے اپنی دو متضاد کیفیات کا ذکر کیا:

> مَیں جانتا ہو کہ میرے احباب مجھ کو بھول گئے ہیں، لیکن مجی خوشی محمد ناظر کے ایک ضمنی تذکرے نے میرے دل میں ایک عجیب رقت انگیز اثر پیدا کیا۔ آپ ان کو بُلا کر ضرور میری طرف سے ممنونیت اور محبت کا اظہار فرمائیں۔[25]
>
> ہاں، مَیں نادم اور سخت نادم ہوں کہ مَیں نے کسی تحریر میں مجی و مخلصی مولوی سید ممتاز علی صاحب کے حالات نہیں پوچھے۔ حقیقت میں اس سے زیادہ بدعہدی اور بے وفائی نہیں ہو سکتی۔ آپ ضرور ان کی خیریت، مزاج و شغل موجودہ سے مجھ کو مطلع فرمائیں۔ اگر مصر میں کوئی کتاب ذھب کی مل گئی تو ان کو ہدیہ دینے کے لیے ان شاء اللہ ساتھ لاؤں گا، یہی اس گناہ کا کفارہ ہوگا۔[26]

یہ بھی ہے کہ وہ پردیس میں بیٹھے دوستوں کی کامیابیوں سے خوش ہوتے ہیں اور اپنی کامیابیوں کا ذکر کر کے مسرور ہوتے ہیں۔ ۵ محرم کے خط سے دو اقتباس پیش کیے جاتے ہیں:

> مَیں نے اکمل الاخبار میں پڑھا کہ مولوی زین العابدین صاحب 'خان بہادر' ہوئے۔ اگرچہ اخبار میں زائد تصریح نہ تھی، مگر مَیں نے یقین کرلیا کہ ہمارے ہی مولوی زین العابدین خاں صاحب مراد ہیں۔ اگر ایسا ہے (اور ضرور ایسا ہے) تو میری طرف سے لمبی چوڑی عرض کی جائے [کذا]۔[27]
>
> آپ اس خبر کو سن کر خوش ہوں گے کہ مجھ کو پیش گاہ سلطانی سے درجۂ چہارم کا تمغۂ مجیدی عطا ہوا۔[28]

لیکن ساتھ ہی شبلی نے ایک ایسی خواہش کا اظہار کیا، جس سے حیرت ہوتی ہے۔ نام و نمود کی ایسی خواہش کی بظاہر شبلی سے توقع نہیں کی جاسکتی، بہرحال انھوں نے لکھا کہ 'اب تو امید ہے کہ وہاں [ہندوستان] پہنچ کر مجھ کو آپ 'شمس العلماء' کا خطاب ضرور ہی دلوائیں گے'۔[29]

اور شاید اس خدشے کے پیش نظر کہ سرسید اسے محض خوش طبعی خیال نہ کریں، یہ بھی لکھ گئے کہ 'ورنہ گستاخی معاف، وہی مثل صادق آئے گی کہ چراغ تلے اندھیرا'۔[30] پھر یوں ہوا کہ سرسید کے یہ لکھنے پر کہ 'مولانا شبلی جیسے فاضل کی قدردانی ترکی گورنمنٹ تو اتنی کرے کہ 'تمغۂ مجیدی' عطا فرمائے اور انگریزی حکومت، بڑے افسوس کی بات ہے، اس فرض سے غافل رہے'۔[31] شبلی کو جنوری ۱۸۹۴ء میں 'شمس العلماء' کا خطاب مل گیا؛ لیکن دوسری جانب انگریز حکومت یہ گمان کرنے لگی تھی کہ شبلی شاید سلطان عبدالحمید کا سفیر بن کر ہندوستان پلٹے ہیں، چنانچہ حکومت کی یہ بدگمانی شبلی کا تعاقب کرتی رہی، حتیٰ کہ ۱۹۱۱ء کے بعد کسی موقع پر وہ نشانِ محبت، یعنی 'تمغۂ مجیدی' چوری ہوگیا۔[32]

شبلی کی سیاحت محض کتب بینی تک محدود نہ رہی، بلکہ انھوں نے اس ملک کو کھلی آنکھ سے دیکھا۔ شبلی سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں دیگر سماجی و سیاسی اداروں کے ساتھ ساتھ تعلیمی نظام کی ابتری کی اصل وجہ انگریز سامراج کی حکومت ہے، لیکن ممالک اسلامیہ کی سیاحت کے دوران، جہاں خود مسلم حکومتیں قائم تھیں، ہندوستان ایسی صورتِ حال نظر آئی تو وہ بہت مایوس ہوئے۔ ایک خط میں اپنی اس ذہنی و روحانی اذیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا، اس میں یورپ کا ذرا بھی پرتو نہیں۔ جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے، لیکن دونوں کے حدود جدا رکھے گئے ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے، اصلی ترقی نہ ہو سکے گی۔ یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے، جس کا رونا ہے۔[33]

شبلی دیگر امور کے ساتھ ساتھ مختلف شخصیات سے ہونے والے ملاقاتوں کا احوال بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

> پرسوں مَیں عثمان پاشا سے ملا۔ نہایت اخلاق سے ملے، عربی سمجھ لیتے ہیں اور دو چار معمولی باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ مَیں نے ان کے ہاتھ کا بوسہ دینا چاہا، لیکن راضی نہ ہوئے، بلکہ الٹے خود میری تقلید کرنی چاہی۔ رخصت کے وقت فرمایا کہ

> آپ جب چاہیں، تشریف لائیں، بہت خوشی سے ملوں گا، تمام اور بڑے بڑے پاشاؤں سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔[44]

> آج مَیں حسین حبیب آفندی سے، جو بمبئی میں سفیر تھے اور اب یہاں پولیس جنرل ہیں، ملا۔ بے انتہا مہربانی کی۔ گھر کے تمام کمرے دکھائے، دعوت کی اور بہت سی مہربانیاں کیں۔ وہ اردو بخوبی بولتے ہیں۔ آپ فوراً سیرۃ النعمان کا ایک نسخہ، جو وہاں مَیں دیکھ آیا ہوں اور اس پر کالج کی مہر نہیں لگی ہے، بھیج دیجیے۔ ضرور مَیں ان کو ہدیہ دوں گا، وہ اسی مذاق کے آدمی ہیں۔[45]

کہنے کو تو علی گڑھ کالج سے شبلی کا تعلق سرسید کی وفات (۲۷ر مارچ ۱۸۹۸ء) کے بعد (مئی ۱۸۹۸ء) تک قائم رہا، لیکن بہت دن پہلے سے دونوں کے مابین اختلافات رونما ہو چکے تھے۔ سید سلیمان ندوی نے قیصر باغ لکھنؤ میں ۲۷ر دسمبر ۱۸۹۷ء کو ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں پڑھے گئے ایک مقالے 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' کے بعض اندراجات کو دونوں کے اختلافات کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے،[46] لیکن سرسید کے نام شبلی کے اس سے بہت پہلے کے خطوط میں موجود تلخی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں اکابر میں 'سب ٹھیک نہیں' تھا۔ کالج میں درس و تدریس کے حوالے سے ۲۰ر جنوری ۱۸۹۵ء کو شبلی نے ایک تجویز پیش کی:

> مولانا عبداللہ صاحب انصاری ماشاء اللہ جلیل القدر فاضل اور نہایت بابرکت شخص ہیں۔ اب یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ، جو کہ خاکسار کالج کلاس کے طلبہ کو پڑھاتا ہے، وہ مولانا صاحب ممدوح کے متعلق کر دیا جائے۔ علاوہ عمدہ تعلیم پانے کے طلبہ کو ان کی برکت سے روزانہ مستفیض ہونے کا موقع ملے گا۔[47]

اسی روز سرسید نے اس کے جواب میں لکھا کہ 'یہ کام مولوی عبداللہ صاحب کے متعلق نہیں ہو سکتا۔ ان سے ایک خاص کام طے ہوا ہے، دیگر خدمات سے ہمیشہ مستثنیٰ رہیں گے۔' سرسید یہاں تک لکھ گئے کہ 'آپ برسوں سے بخوشی خاطر یہ کام کر رہے ہیں، اب کیوں خود

غرضی سے جی چراتے ہیں'۔[48] ایسی صورتِ حال سے شبلی کو سخت مایوسی ہوئی۔ ردِعمل کے لیے شبلی کا خط پیش کیا جا سکتا ہے، جس میں آہنگ اور تلخی میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ شبلی لکھتے ہیں:

> اگر جناب کو کچھ خرابی کا احتمال ہو تو مولوی عبداللہ صاحب کے متعلق یہ کام صرف ایک دو مہینے کے لیے کر دیا جائے۔ میری یہ استدعا ایک معمولی بات تھی، لیکن بعض وقت بدقسمتی سے چھوٹی سے بات بھی ایک امر مہم بن جاتا ہے۔ جب مولوی صاحب ہر ہفتہ نہایت تفصیل و توضیح کا موقع پا کر وعظ میں محتاط ہو گئے ہیں تو ترجمہ میں کیوں نہ احتیاط کریں گے۔ مَیں پہلے روز ان کو قرآن کے گھنٹہ میں بلا کر دکھا دوں گا کہ مَیں اس طرح پڑھاتا ہوں اور آپ کو بھی یونہی پڑھانا چاہیے۔ ورنہ وہ ضرور اسی طرح پڑھائیں گے۔ کالج کا، بخدا، اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، بلکہ جو شخص خاص دینیات کے لیے ایک معقول مشاہرہ پاتا ہو، کالج کی انتظامی حیثیت سے یہ کام اس کے متعلق ہونا بہتر ہے۔ میری ذاتی غرض صرف اس قدر ہے کہ مجھ کو لکھنے پڑھنے کے لیے وقت نکل آئے گا، ورنہ چونکہ جاڑوں میں مدرسہ ۹ ربجے سے ہوتا ہے اور صبح ۷ ربجے ہوتی ہے، اس لیے ضروریات سے فارغ ہو کر ذرا دیر کے، بعد کھانا کھانے کے، مدرسہ جانے کی پڑ جاتی ہے۔ اگر میری استدعا کو میرے جی چرانے اور کسی قسم کی خود غرضی پر محمول کیا جائے تو میری کمال بدقسمتی۔ اس باب میں میرے یہ آخری کلمات ہیں۔[49]

شبلی نے تو 'آخری کلمات' لکھ دیے، لیکن سرسید کے نقطۂ نظر سے ابھی 'حرفِ آخر' باقی تھا، چنانچہ انھوں نے ۲۲ر جنوری ۱۸۹[illegible] کو [illegible]رج بالا مراسلے کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ 'آپ نے اپنی طولانی تحریر کو ایسے عنوان سے شروع کیا، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مجھ کو مولوی صاحب کے کام پر اطمینان نہیں'، بلکہ سرسید نے کا کہنا تھا کہ 'مجھے ان پر بہت بڑا اطمینان ہے، وہ صدہا علما میں سے اس جلیل القدر کام کے واسطے منتخب کیے گئے ہیں۔ مَیں کسی طرح ان کے خلافِ مرضی کام ان کے متعلق کرنا پسند نہیں کرتا'۔ سرسید نے یہاں تک

لکھا کہ میں منشی سعید احمد صاحب (؟) کی معرفت مولوی صاحب کی مرضی مبارک دریافت کروں گا۔[۴۰] اس سلسلے میں آئندہ کیا کارروائی ہوئی؟ اس کی بابت معلوم نہیں ہو سکا۔

سرسید کے نام شبلی کا آخری خط ۱۲؍ستمبر ۱۸۹۵ء کو لکھا گیا، جس میں انھوں نے علی گڑھ کالج میں ہونے والے مبینہ غبن کے بارے میں سرسید کو آگاہ کیا۔ انھوں نے لکھا کہ 'غبن کا معاملہ، خدا خیر کے، بخیر انجام ہو۔ ہم لوگ بایمان و یقین جانتے ہیں کہ اَور صیغوں میں بھی نہایت ابتری ہے، مگر جرأتِ اظہار نہ تھی۔ کم از کم سال میں [ایک بار] قاعدے کے موافق جانچ تو ہونی چاہیے۔'[۴۱] اس خط کے جواب میں سرسید نے محض دو جملے لکھ کر بھیجے، یعنی 'جن صیغوں میں آپ کے نزدیک، ابتری ہے، ان کے نام بتانے ضروری ہیں۔ امید ہے کہ اس سے مطلع فرماویں گے۔'[۴۲]

شبلی کے خطوط کی جمع آوری سے متعلق اوّل اوّل جب شیخ رشید الدین انصاری نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو جواب میں شبلی نے لکھا کہ 'میرے خطوط بالکل بے مزہ ہوتے ہیں۔ ان کو کیا جمع کرتے ہو۔ جب مجھ کو خود مزہ نہیں آتا تو اَوروں کو کیا آئے گا۔'[۴۳] لیکن شبلی کے بعض خطوں میں ایسی شگفتگی پائی جاتی ہے کہ اگر شبلی اس طرف توجہ کرتے تو ان کے خط ایسے 'بے مزہ' نہ رہتے۔ سرسید کے نام ایک خط سے اقتباس دیکھیے:

> قسطنطنیہ کی آب و ہوا کی عمدگی اس قابل ہے کہ انسان اپنی عمر کا ایک حصہ ضرور اس کی نذر کرے۔ اگر میں پرہیز کر سکتا تو موسم کی عمدگی سے بہت فائدہ اٹھاتا اور خوب موٹا تازہ ہو کر آتا، لیکن یہاں کے لذیذ میوے، جو لذت کے ساتھ کم بخت نہایت ارزاں بھی ہیں، کسی طرح مجھ جیسے شخص کو اعتدال کی حد پر نہیں رہنے دیتے۔[۴۴]

دستیاب خطوط کی روشنی میں ہونے والی درج بالا گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کے نام شبلی کے تمام خطوط منصۂ شہود پر نہیں آسکے۔ موجودہ خطوں سے اگرچہ سرسید اور شبلی کے تعلقات کے تمام نشیب و فراز نمایاں نہیں ہوتے، تاہم لب و لہجے کے تغیرات کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ان خطوں سے سرسید کے دل میں شبلی کی اہمیت، سرسید سے مخاطب ہوتے

ہوئے شبلی کا انکسار، اہل خانہ اور افرادِ خاندان سے متعلق معلومات، ترکی کے کتب خانوں کا کسی قدر احوال، کتب کی دستیابی، معتزلہ سے ان کی دلچسپی، قسطنطنیہ میں مشاہیر سے ملاقاتوں، ترک تعلیمی اداروں کی صورتِ حال، وطن میں عزیزوں اور دوستوں سے ان کے قلبی تعلق، تمغہ ملنے پر اظہارِ مسرت اور امتیاز حاصل کرنے کی خواہش اور سرسید سے تعلقات میں در آنے والی خلیج کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر کبھی گم شدہ خطوط دریافت ہو سکے تو شاید ان دونوں عظیم شخصیات کے درمیان اشتراکات و اختلافات کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھا جا سکے؛ البتہ سرسید کی رحلت کے بعد ۲۹؍مارچ ۱۸۹۸ء کو نواب سید علی حسن خاں کے نام لکھے گئے ایک عربی خط سے شبلی کے دل میں سرسید کے احترام کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے:

> نمی دانم حدیث نامه چون است
> همین دانم که عنوانش به خون است

> تزعزعت ارکان الملّۃ!
>
> اعنی انتقل السیّد احمد خان بہادر الیٰ جوار رحمۃ ربّہ و ذلک یوم الاحد ۲۷ مارچ و تفرق شملنا۔ انی لا اقدر علی ان اشتغل بشیء الا بعد برهۃ من الزمان۔[۴۵]

ترجمہ: [ملت کی بنیادیں ہل گئیں، یعنی سرسید احمد خاں بہادر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ سانحہ اتوار ۲۷؍مارچ کو رونما ہوا، جس سے قومی یکجہتی کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایک مدت تک میں اپنے معمولات جاری نہ رکھ سکوں گا۔][۴۶]

۞

۱. شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ قبل از ۳؍جنوری ۱۸۷۹ء، مشمولہ مکتوباتِ شبلی مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، اعظم گڑھ: ادبی دائرہ، ۲۰۱۲ء، ص ۱۷

۲. ایضاً

۳. پروفیسر اصغر عباس: 'بعض مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط'، مطبوعہ اردو ادب، علی گڑھ، شمارہ ۱، ۱۹۷۰ء، حاشیہ ۱۰۶۔ بحوالہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی (مرتب): مکتوباتِ شبلی، ص ۲۹

۴. شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۳؍مئی ۱۸۸۳ء، مشمولہ مکتوباتِ شبلی، ص ۱۸

۵ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۱۸؍اگست ۱۸۸۴ء، مشمولہ مکتوبات شبلی، ص ۱۹-۲۰
۶ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی (مرتب): مکتوبات شبلی، ص ۳۰
۷ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ یکم جون ۱۸۹۰ء، مشمولہ مکتوبات شبلی، ص ۴۱
۸ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۸؍مئی ۱۸۹۲ء، مشمولہ مکتوبات شبلی، ص ۴۳
۹ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۲۵؍مئی ۱۸۹۲ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳-۱۴
۱۰ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۱۵؍جون ۱۸۹۲ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۵
۱۱ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۹
۱۲ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی: آثار شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۳ء، ص ۵۴۲
۱۳ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۲۲۷
۱۴ شبلی نعمانی بنام سرسید، ۲۵؍مئی ۱۸۹۲ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ۱۳
۱۵ ایضاً، ص ۱۴
۱۶ ایضاً
۱۷ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۵؍محرم الحرام ۱۳۱۰ء، مشمولہ مکتوبات شبلی، ۲۶
۱۸ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۲۵؍مئی ۱۸۹۲ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۴-۱۵
۱۹ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۱۵؍جون ۱۸۹۲ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۶
۲۰ ایضاً
۲۱ ایضاً
۲۲ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۲۵؍مئی ۱۸۹۲ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۴
۲۳ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۱۵؍جون ۱۸۹۲ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۶
۲۴ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۵؍محرم الحرام ۱۳۱۰ھ، مشمولہ مکتوبات شبلی، ص ۲۵
۲۵ ایضاً
۲۶ ایضاً
۲۷ ایضاً
۲۸ ایضاً، ص ۲۷
۲۹ ایضاً
۳۰ ایضاً
۳۱ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۲۰۴

۳۲ ایضاً، ص ۲۳۳
۳۳ شبلی بنام سرسید، مرقومہ ۱۵؍جون ۱۸۹۲ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۶
۳۴ ایضاً، ص ۱۵
۳۵ ایضاً، ص ۱۶-۱۷
۳۶ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، ص ۱۳۶
۳۷ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۲۰؍جنوری ۱۸۹۵ء، مشمولہ مکتوبات شبلی، ص ۴۷
۳۸ سرسید احمد خاں بنام شبلی نعمانی، مرقومہ ۲۰؍جنوری ۱۸۹۵ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ص ۳۱
۳۹ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۲۲؍جنوری ۱۸۹۵ء، مشمولہ مکتوبات شبلی، ص ۴۸
۴۰ سرسید احمد خاں بنام شبلی نعمانی، مرقومہ ۲۲؍جنوری ۱۸۹۵ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ص ۳۱-۳۲
۴۱ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۱۲؍ستمبر ۱۸۹۵ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۷
۴۲ سرسید بنام شبلی نعمانی، مرقومہ ۱۵؍ستمبر ۱۸۹۵ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۱۷
۴۳ شبلی نعمانی بنام شیخ رشید الدین انصاری، مرقومہ ۱۹؍اپریل ۱۹۰۳ء، مشمولہ مکاتیب شبلی اول، ص ۳۰۷
۴۴ شبلی نعمانی بنام سرسید، مرقومہ ۵؍محرم الحرام ۱۳۱۰ھ، مشمولہ مکتوبات شبلی، ص ۲۳
۴۵ شبلی نعمانی بنام نواب سید علی حسن خاں، مرقومہ ۲۹؍مارچ ۱۸۹۸ء، مشمولہ مکاتیب شبلی دوم، ص ۱۶۲
۴۶ مشمولہ خالد ندیم: اردو ترجمہ مکاتیب شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۶ء، ص ۵۴

□□□

علامہ شبلی کے چند ناتمام تصنیفی منصوبے

علامہ شبلی نعمانی کی زندگی تصنیف و تالیف سے یوں وابستہ رہی کہ اوائل نو جوانی سے آخری ایام تک وہ متواتر کسی نہ کسی موضوع پر لکھتے رہے۔ ابتدا میں فروعی مسائل پر قلم اُٹھایا اور اسکات المعتدی علی انصات المقتدی اور ظل الغمام فی مسئلہ القراۃ خلف الامام لکھیں، جس کے بعد مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم اور الجزیہ کے ذریعے انھوں نے خالص علمی موضوعات پر طبع آزمائی کی: المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق اور اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر نامی سوانح عمریاں تحریر کیں؛ سلطنت عثمانیہ کی سیاحت پر مشتمل سفر نامہ روم و مصر و شام لکھا؛ الغزالی، علم الکلام، الکلام اور سوانح مولانا روم کے نام سے مسلم فلسفہ کی تاریخ مرتب کی اور موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم کے ذریعے ادب کی خدمت کی۔ اور سب سے بڑا کارنامہ، جس کی داد آج تک وہ وصول کر رہے ہیں، وہ سیرت النبیؐ ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مقالات، خطبات، اردو فارسی شاعری اور اردو فارسی اور عربی مکتوبات بھی یادگار ہیں۔

علامہ شبلی محض ستاون برس کی عمر میں علم و ادب کی اس قدر خدمت کر سکے، جس کا بالعموم تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بزرگوں اور عزیزوں کی طرف سے عدم تعاون، دو بیویوں اور بعض بچوں کی وفات، دوستوں کی بے اعتنائی، ندوہ میں شدید مخالفت، اپنی ناقدری کا احساس، اوائل عمری سے صحت کی دگرگوں صورت حال، حتیٰ کہ پچاس سال کی عمر میں ایک ٹانگ کا پنڈلی تک کٹ جانا، آخری عمر میں ندوہ سے دستبرداری، سیرت النبیؐ کے مقدمے پر

سخت اعتراضات اور کفر کے فتوے، یہ معمولی تکلیفیں نہ تھی؛ لیکن علامہ کی تگ و تاز اور تصنیف و تالیف میں کوئی امر مانع نہ ہوا اور وہ چو مکھی لڑائی لڑتے ہوئے اتنا کام کر گئے، جتنا کوئی ادارہ ہی کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود شبلی کے بعض منصوبے ایسے بھی تھے، جو روبعمل نہ ہو سکے۔ ان کی بعض تحریروں میں ان کے متعدد ارادوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان منصوبوں میں چند ایک کا آغاز بھی ہوا اور کچھ خیال سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ذیل میں ان تمام ارادوں اور منصوبوں کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

ردِ تذکرۃ [المنتھی فی ردِ اسکات المعتدی]

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ [علی گڑھ] کالج جانے سے پہلے غیر مقلدین سے مناظرے کا بہت شوق تھا۔ حافظ سلامت اللہ صاحب جیراج پوری اعظم گڑھ میں غیر مقلدوں کے سرگروہ تھے، تقلید و حنفیت کے رد میں وہ چھوٹے چھوٹے رسالے لکھتے تھے، مولانا [شبلی] ان کا جواب دیتے تھے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے علامہ شبلی کا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ نہ صرف یہ کہ واجب نہیں، بلکہ مکروہ ہے: اسی بنا پر انھوں نے اسکات المعتدی علی انصات المقتدی کے نام سے عربی میں چوبیس صفحات پر مشتمل ایک مختصر رسالہ لکھا۔ اس رسالے میں مولانا شبلی نے متن میں 'قال بعض العلماء' لکھ کر مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کی تحقیق کا رد کیا تھا۔ مولانا عبدالحی کے شاگردوں میں سے مولانا نور محمد ملتانی نے تذکرۃ المنتھی فی ردّ اسکات المعتدی کے ذریعے شبلی کے رسالے کا جواب دیا۔ مولوی محمد عمر کے نام ایک فارسی خط مرقومہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۲ء میں شبلی اس رد کا جواب لکھنے میں حائل بعض مجبوریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ...... بارے توفیق رہبری کرد کہ حنا از پائے خامہ کشادی و طرح مکاتبت درمیان نہادی، پارہ از ردّ تذکرہ برزبان قلم آمدہ بود کہ ہمدرین میان مارا بکار امانت گماشتند و از ہجوم کار و تراکم افکار کمری تیج کردن نتوانستم و چو از ایں کشاکش فارغ نشستم دیگر روے داد، یعنی کارم بہ گودام متعلقات او افتاد و ہر چند آں چناں کارے سزا ایں

ہیچ کارہ نہ بود مگر مرا از امتثال امر حضرت قبلہ گاہی چارہ نہ بود، اکنونکہ ازیں ہرزہ گرد بجا ستوہ آمدہ خود را دراین جا رسانده ام، ان شاء اللہ در اندک زمانے از عہدۂ ردِ تذکرہ بدر مے آیم۔[۳]

ترجمہ: ...... خیر، توفیق کی یاوری سے قلم کا زنگ تو دور کیا اور مکاتبت کا آغاز کیا۔ ردِ تذکرہ کے سلسلے میں ابھی تھوڑا بہت ہی لکھا تھا کہ مجھے اس کام میں [قرق] امین بنا دیا گیا ہے۔ ہجوم کار اور کثرتِ افکار کے باعث فی الحال اس کام کے لیے دوبارہ کمربستہ نہیں ہو سکتا۔ اس کشمکش سے نجات ملی تو ایک اور افتاد آن پڑی، یعنی گودام اور اس کے متعلقات کی نگرانی کرنی پڑی۔ اگرچہ یہ کام میرے لائق نہیں تھا، لیکن مجھے حضرت قبلہ گاہ [والد] کے تعمیل حکم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اب کہیں جا کر اس بیگار سے جان چھوٹی ہے اور میں واپس آ گیا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد ہی تذکرہ کا جواب مکمل کر دوں گا۔[۴]

لیکن دستیاب معلومات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ شبلی یہ رسالہ نہ لکھ سکے۔

تاریخِ بنی العباس

شروع شروع میں شبلی نے بنی عباس کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا، البتہ اس کے بارے میں پہلی مرتبہ انھوں نے ۱۸۸۳ء میں ذکر کیا اور مولوی محمد سمیع کو لکھا کہ 'مجھ کو تو آج کل تاریخ بنی العباس کی پڑی ہے'۔[۴] ۹ر اپریل ۱۸۸۴ء کو مطلع کیا کہ 'اس وقت تک میں معتصم کا حال لکھ رہا ہوں اور پہلی جلد ان شاء اللہ یہیں تک ختم کر دی جائے گی'،[۵] لیکن ۲۷ر نومبر ۱۸۸۴ء کو انھی کے نام خط میں اپنی مصروفیات کے تذکرے کے بعد بتایا کہ 'اپنی کیا بتاؤں! وہی تاریخ کا جھگڑا ہے، ہر روز چار سطریں لکھ لیتا ہوں'۔[۶]

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مذکورہ تاریخ کی پہلی جلد، جو معتصم تک ختم ہوئی تھی، بعد میں کتابی صورت میں شائع کیوں نہ ہو سکی؟ سید سلیمان ندوی کا کہنا ہے، 'افسوس کہ اس تاریخ کا خیال بعد کو چھوڑ دیا گیا اور 'مشاہیر فرماں روانِ اسلام' تک محدود کر دیا گیا۔'[۷]

ہیروز آف اسلام

تاریخ بنی العباس کا خیال ترک کرنا پڑا تو انھوں نے اپنے منصوبے کو ہیروز آف اسلام تک محدود کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے المامون (مطبوعہ ۱۸۸۷ء) کے دیباچے میں لکھا:

> ایک مدت سے میرا ارادہ تھا کہ اسلامی حکومتوں کی ایک نہایت مفصل اور بسیط تاریخ لکھوں، لیکن مشکل یہ تھی کہ نہ میں تمام خاندانوں کا استقصا کر سکتا تھا، نہ کسی خاص سلسلے کے انتخاب کی مجھ کو کوئی وجہ مرجح ملتی تھی۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ رائل ہیروز آف اسلام (یعنی نامور فرماں روانِ اسلام) کا ایک سلسلہ لکھوں، جس کا طریقہ یہ ہو کہ اسلام میں آج تک خلافت و سلطنت کے جتنے سلسلے قائم ہوئے، ان میں سے صرف وہ نامور انتخاب کیے جائیں، جو اپنے طبقے میں عظمتِ حکومت کے اعتبار سے اپنا ہمسر نہ رکھتے تھے اور ان کے حالات اس ترتیب اور جامعیت سے لکھے جائیں کہ تاریخ کے ساتھ لائف کا مذاق بھی موجود ہو۔ جن خاندانوں کو میں نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے، ان کے نام یہ ہیں:[۸]

اس کے بعد شبلی نے مختلف حکمران سلسلوں میں سے ایک ایک ممتاز حکمران کو منتخب کیا، یعنی خلفائے راشدین میں سے حضرت عمر فاروقؓ، بنو اُمیہ سے ولید بن عبدالملک، عباسیہ سے مامون الرشید، بنو اُمیہ اندلس سے عبدالرحمٰن ناصر، بنو حمدان سے سیف الدولہ، سلجوقیہ سے ملک شاہ، نوریہ سے نورالدین محمود زنگی، ایوبیہ سے صلاح الدین ایوبی، موحدینِ اندلس سے یعقوب بن یوسف اور ترکانِ روم سے سلیمان اعظم۔ دیگر حکمران خاندانوں سے صرفِ نظر کرنے کا جواز پیش کرتے ہوئے شبلی نے لکھا:

> ان خاندانوں کے سوا اور بھی بہت سے اسلامی خاندان ہیں، جو تاج و تخت کے مالک ہوئے، مگر میں نے ان کو دانستہ چھوڑ دیا ہے۔ ان میں سے بعضوں کے متعلق (مثلاً غزنویہ، مغلیہ، تیموریہ) تو اس وقت ہماری زبان میں متعدد تصنیفیں موجود ہیں، بعض ایسے ہیں کہ شانِ حکومت یا وسعتِ سلطنت کے

> اعتبار سے ان کو یہ رتبہ حاصل نہیں کہ ہیروز کے معزز دربار میں ان کے لیے جگہ خالی کی جائے۔[9]

اگرچہ تمام مسلم حکمران خاندانوں میں سے چند خاندان منتخب کیے اور پھر ہر خاندان سے ایک ممتاز حکمران چنا، لیکن اس کے باوجود شبلی کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ انھوں نے بتایا:

> جس زمانے میں مجھ کو ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا، اُسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے، وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا۔ یہی خیال تھا، جس نے اوّل اوّل اس سفر [روم و مصر و شام] کی تحریک دل میں پیدا کی، کیونکہ یہ یقین تھا کہ مصر و روم میں اسلامی تصنیفات کا جو بقیہ رہ گیا ہے، ان سے ایک ایسا سلسلہ تالیف ضرور تیار ہو سکتا ہے۔[10]

لیکن شبلی کی مجوزہ فہرست میں سے حضرت عمر فاروق (الفاروق) اور مامون الرشید (المامون) ہی ان کی تحقیق کا موضوع بن سکے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ سلسلہ تیموریہ شبلی کے پیش نظر نہ تھا، مگر دسمبر ۱۹۰۶ء سے مارچ ۱۹۰۸ء کے دوران میں انھوں نے الندوہ میں اس خاندان میں سے اورنگ زیب عالم گیر پر سلسلہ مضامین شروع کیا، جنھیں بعد میں اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر کے نام سے کتابی صورت میں ۱۹۰۹ء میں شائع کر دیا گیا۔ اگرچہ ۱۵ ستمبر ۱۹۱۰ء کو سید احمد مرتضیٰ نذر کے نام لکھے گئے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں لکھی گئیں سلطان صلاح الدین ایوبی کی سوانح عمریوں کو لغو سمجھتے تھے، چنانچہ ایک مدت تک سلطان ایوبی کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ باندھتے رہے، لیکن وہ ایسا کر نہ سکے اور نہ انھیں تب اس کے لکھنے کی امید ہی رہی تھی۔[11] اس طرح 'ہیروز آف اسلام' کے سلسلے سے تین حکمرانوں پر تصانیف معرضِ تحریر میں آ سکیں؛ جب کہ آٹھ حکمرانوں، یعنی ولید بن عبدالملک، عبدالرحمٰن ناصر، سیف الدولہ، ملک شاہ، نورالدین زنگی،

سلطان صلاح الدین ایوبی، یعقوب بن یوسف اور سلیمان اعظم سے متعلق ان کے منصوبے روبعمل نہ ہو سکے۔

نامورانِ اسلام

۱۸۹۲ء میں جب سیرۃ النعمان شائع ہوئی تو 'ہیروز آف اسلام' میں کسی قدر ترمیم کا اظہار ہوا۔ شبلی نے اس کے دیباچے میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

> 'نامورانِ اسلام'، جس کا ایک حصہ المامون چھپ کر شائع ہو چکا ہے، اوّل مجھ کو اس کا خیال پیدا ہوا تو نہایت وسیع بنیاد پر ہوا۔ جس طرح میں نے خلافت و سلطنت کے مختلف خاندانوں سے نامور انتخاب کیے: ارادہ تھا، اسی طرح سے علوم و فنون کے جدا جدا خاندان قائم کیے جائیں اور جو لوگ ان خاص خاص فنون میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، ان کو سلسلے کا ہیرو قرار دیا جائے، مگر اتنا بڑا کام تنہا میرے بس کا نہ تھا؛ مجبوراً حیثیت حکومت کی قید لگا کر میں نے اس وسیع خیال کو بہت کچھ محدود کر دیا، بلکہ سلسلۂ حکومت سے بھی بہت سے خاندان چھوڑ دیے، تاہم وہ خیال دل سے نہ گیا کہ فرصت ہو تو اہلِ کمال کا دربار بھی سجایا جائے کہ السیف والقلم تو اَمان۔[12]

'نامورانِ اسلام' کے سلسلے میں انھوں نے امام ابوحنیفہؒ (سیرۃ النعمان)، امام غزالیؒ (الغزالی) اور مولانا روم (سوانح مولانا روم) کی سوانح و شخصیات پر تصانیف پیش کیں، لیکن الغزالی اور سوانح مولانا روم کو 'نامورانِ اسلام' کے بجائے سلسلہ کلامیہ میں شمار کیا جانا چاہیے؛ یوں 'نامورانِ اسلام' میں سے صرف امام ابوحنیفہؒ پر کتاب منظر عام پر آ سکی۔

قرآن کا اعجاز

۲۱ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو مولوی سید ممتاز علی (۱۸۶۰ء-۱۹۳۵ء) کو اپنے مختلف تصنیفی ارادوں سے متعلق مطلع کرتے ہوئے 'قرآن مجید کا اعجاز' کا ذکر کرتے ہیں۔[13] البتہ مقالات شبلی جلد پنجم میں شامل ان کی ایک مختصر تحریر 'اعجاز القرآن' کے علاوہ اس منصوبے کا کہیں تذکرہ نہیں۔

علوم القرآن

محسوس ہوتا ہے، شبلی کا 'قرآن مجید کا اعجاز' نامی منصوبہ مسلسل ان کے ذہن میں گردش کرتا رہا اور اس کے بارے میں متواتر سوچ بچار کرتے رہے، چنانچہ یکم دسمبر ۱۹۰۹ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ایک خط میں ندوہ میں اپنی روز افزوں مصروفیات کی بابت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'ادھر علوم القرآن لکھنا شروع کر دیا ہے، وہ بھی کچھ ہو جائے گا'،[۱۴] لیکن وہ خواہش کے باوجود، اس طرف توجہ نہ دے سکے، کیونکہ ریاست ٹونک کے سررشتہ دار سید احمد مرتضیٰ نذر کے نام ۶ ستمبر ۱۹۱۰ء کے مراسلے میں شعر العجم کی چوتھی جلد کا ذکر کرتے ہیں، جس کی تکمیل میں ان کا زیادہ وقت صرف ہو رہا تھا، ساتھ ساتھ دعا کرتے ہیں کہ 'خدا جلد اس سے فرصت دے، اصلی کام علوم القرآن اور آنحضرتؐ کی سوانح عمری ہے، ان کے انجام کی خدا توفیق دے'۔[۱۵]

شبلی اُن دنوں پچپن برس کے ہو گئے تھے اور قویٰ میں اضمحلال محسوس کرنے لگے تھے، علاوہ ازیں ان کی خوراک دن بھر میں صرف ایک چپاتی رہ گئی تھی؛ چنانچہ وہی ہوا، جس کا شبلی کا خدشہ تھا۔ اگرچہ سیرت النبیؐ کی تالیف کا اتنا سامان ہو گیا کہ ان کے شاگرد رشید، سید سلیمان ندوی کی توجہ سے یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی، لیکن زیر نظر منصوبے پر باقاعدہ کام نہ کر سکے، البتہ چند ایک مقالات سے اس موضوع سے ان کی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً 'علوم القرآن'، 'تاریخ ترتیب قرآن'، 'اختلاف مصحف اور قرأت'، 'قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں؟'، 'قضا و قدر اور قرآن مجید'، 'یورپ کے عدیم الصحۃ ہونے کا دعویٰ'، 'قرآن مجید کی تدوین کی کیفیت' اور 'تحریر و کتابت'۔ سید سلیمان ندوی نے یہ تمام تحریریں مقالات کی جلد اوّل میں شامل کر دی ہیں۔

عربی شاعری کی ہسٹری

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، ۲۱ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو شبلی نے اپنی تین تصانیف کے منصوبے

کا ارادہ ظاہر کیا تھا، اُن میں قرآن مجید کا اعجاز، فارسی یا عربی شاعری کی ہسٹری اور الغزالی شامل ہیں۔ اس موضوع پر 'عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ' اور 'شعر العرب (کتاب العمدہ لابن رشیق)' کے عنوانات کے تحت ان کی دو تحریریں مقالات شبلی کی دوسری جلد میں شامل ہیں، تاہم انھوں نے عربی شاعری کی تاریخ پر باقاعدہ کام نہیں کیا۔ اس کے برعکس شعر العجم کے نام سے پانچ جلدوں میں فارسی شاعری کی تاریخ مرتب کر دی۔ شعر العجم کے مندرجات کو دیکھتے ہوئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر شبلی عربی شاعری کی تاریخ پر توجہ دے سکتے تو اردو میں ایک اَور نادر کتاب کا اضافہ ہو جاتا۔

اخلاقِ عرب

علامہ شبلی کا ایک مضمون بعنوان 'حضرت اسماؓ' مقالات کی پانچویں جلد میں پہلی تحریر کے طور پر شامل ہے، جس کے ذیلی عنوان کے طور پر 'اخلاقِ عرب' مندرج ہے۔ اس ذیلی عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ ایسا منصوبہ تھا، جس کے تحت وہ کوئی سلسلۂ مضامین لکھنا چاہتے تھے۔ اسی جلد میں 'متنبی' کے نام سے ایک اَور مضمون بھی شامل ہے، جس کے آغاز میں علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ 'الندوہ میں ہم نے 'اخلاقِ عرب' کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس کا صرف ایک نمبر نکل کر رہ گیا۔ آئندہ وہ سلسلہ پھر شروع ہوگا، لیکن اس مضمون میں بھی اس عنوان کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے'،[۱۶] لیکن دستیاب معلومات کی بنا پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان دو مضامین کے علاوہ وہ اس منصوبے پر زیادہ توجہ صرف نہ کر سکے اور یہ سلسلہ مضامین جاری نہ رہ سکا اور کوئی تالیف بھی منصۂ شہود پر نہ آ سکی۔

مجددانِ اسلام

شبلی نے الندوہ جلد ۵ نمبر ۶ میں مطبوعہ اپنے ایک مضمون 'علامہ ابن تیمیہ حرانی' کا سرِ عنوان 'مجددانِ اسلام' دیا ہے۔ اگرچہ شبلی کے کسی خط، تحریر یا گفتگو سے اس سرِ عنوان کے تحت کسی سلسلۂ مضامین یا کسی تصنیف کا ذکر نہیں ملتا، نہ ہی اس سلسلے میں ان کا کوئی مزید

مضمون شائع ہوا، لیکن اس اہتمام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر کوئی سلسلۂ مضامین یا تالیف دینا چاہتے تھے۔

مشاہیر رجال

سفرِ روم کے حاصلات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شبلی کو مشاہیر رجال کے سوانح حالات قلم بند کرنے کا خیال آیا۔ منشی شرف الدین رام پوری کے نام ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۲ء کے خط میں پوری تفصیل لکھتے ہیں:

> میرا ایک مدت سے خیال ہے کہ بڑی بڑی سوانح عمریاں تو مدتوں میں لکھی جا سکتی ہیں، لیکن ناموران سلف کے مختصر حالات بھی اگر چھوٹے چھوٹے رسالوں کی شکل میں شائع ہوں تو نہایت مفید ہے۔ مَیں نے ترکی میں اس قسم کا ایک سلسلۂ تصنیف دیکھا، جس کا نام مشاہیر رجال ہے۔ اس میں نظام الملک، فخر رازی، مولوی روم اور بہت سے بزرگوں کے حالات میں مستقل رسالے ہیں اور ان کو یکجا کر کے ایک مجموعہ چھاپا گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ ہمارے ملک میں بھی اس قسم کا ایک سلسلہ قائم ہونا چاہیے، یعنی قوم کے چند اعیان، چند بزرگوں کے حالات لکھیں اور ان سب کو ایک مجموعے کی شکل میں مرتب کر کے شائع کیا جائے، چنانچہ مَیں نے بعض دوستوں سے اس کے متعلق خط کتابت بھی کی ہے اور کر رہا ہوں۔[۱۷]

اس سلسلے میں بعض شخصیات پر ان کی کچھ تحریریں ملتی ہیں، جو اَب مقالاتِ شبلی کے جلد پنجم میں شامل ہیں، مثلاً 'موبدانِ مجوس'، جس میں دس شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے، 'زیب النسا'، 'مولوی غلام علی آزاد بلگرامی' اور 'فریدی وجدی بک'۔

بعد ازاں ان میں سے سوانح مولانا روم کے نام سے ایک منصوبہ رو بعمل ہو سکا، جب کہ نظام الملک، فخر الدین رازی یا دیگر بزرگوں اور اعیان سے متعلق سلسلہ تصانیف شرمندۂ تصنیف نہ ہو سکا۔

سیرت ابنِ رُشد

علامہ شبلی اگرچہ مذہبی تعلیم سے آراستہ تھے اور ان کی زندگی کا زیادہ حصہ مذہبی اور ملی موضوعات پر تصنیف و تالیف میں گزرا، لیکن ان کا ذہن بہت جدید تھا، چنانچہ ان کی شخصیت کے بعض بہت دلچسپ پہلو نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ غالباً یہ سرسید کی صحبت کا اثر تھا کہ وہ قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں معتزلہ سے متعلق کتابوں کی متلاشی رہے، دوسری جانب وہ ریاست حیدرآباد میں اپنی ملازمت اور ندوۃ العلما کے زیرِ اثر بہت محتاط بھی تھے؛ چنانچہ وہ مسلم فلسفے پر لکھتے ہوئے نہایت احتیاط سے آگے بڑھے۔ وہ اپنی بات بھی کہنا چاہتے تھے اور یہ بھی کہ کسی بڑی مخالفت سے محفوظ رہیں۔ اس بات کا ثبوت مہدی افادی کے نام ان کا ۱۱ر مئی ۱۹۰۲ء کو لکھا ہوا ایک خط ہے۔ شبلی لکھتے ہیں:

> مَیں علما وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں، اس کے لیے زینے درکار ہیں۔ الغزالی پہلا زینہ ہے، دوسرا تاریخ علم کلام [علم الکلام]، پھر اصلی سطح، یعنی علم کلام جدید [الکلام] ہے، جو زیرِ تصنیف ہے۔۔۔۔۔۔ غزالی میں اگر کھل کھیلتا تو علا برسوں، بلکہ قرنوں کے لیے ہاتھ سے نکل جاتے اور مجھ کو ان سے کٹ کر الگ رہنا منظور نہیں۔[۱۸]

اگرچہ اس سلسلۂ کلامیہ میں انھوں نے مزید کسی شخصیت یا زینے کا ذکر نہیں کیا، لیکن ان کتابوں کی اشاعت (الغزالی ۱۹۰۲ء، علم الکلام ۱۹۰۳ء اور الکلام ۱۹۰۴ء) کے عرصے، یعنی ۹ر مارچ ۱۹۰۳ء کو مولانا حمید الدین فراہی کے نام ایک خط میں مطلع کرتے ہیں:

> مَیں نے علم الکلام نہایت ناتمام کتاب لکھی اور وہ درحقیقت میری تصنیفات کا سب سے ناقص حصہ ہے۔ جدید علم کلام غالباً اچھا لکھا جائے، بہت کچھ ہو چکا ہے۔ عنقریب ہی ابن رُشد کی لائف لکھنا چاہتا ہوں۔[۱۹]

ابن رُشد کی حیات و افکار پر شبلی کی یہ تحریریں الندوہ میں کے جلد اوّل نمبر ۳، معارف جلد ۲ عدد ۱۲، جلد اوّل نمبر ۷ اور جلد ۳ نمبر ۶ میں چھپتی رہی ہیں، جو بعد میں ایک مقالے کی

صورت میں مقالاتِ شبلی جلد پنجم (ص ۱۵-۴۹) میں شامل ہوئیں۔ شبلی اس موضوع پر مزید دادِ تحقیق و تنقید نہ دے سکے اور تقریباً پینتیس صفحات پر مشتمل یہ مضمون کبھی توسیع نہ پا سکا اور نہ ہی کتابی صورت اختیار کر سکا۔

ترجمۂ ابنِ خلدون

امیر عبدالرحمٰن والیِ کابل کو ابنِ خلدون کے ترجمے کا خیال ہوا تو انھوں نے اپنے سفیر کے ذریعے اس منصوبے پر کام کرنے کے لیے مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی نعمانی کی رضامندی معلوم کی۔ شبلی نے اوّل اوّل اپنی خرابیِ صحت کے باعث انکار کیا، لیکن بعد ازاں اعزہ و احباب کے اصرار پر راضی ہو گئے۔ اس پر سفیر نے کُل ترجمے اور اس سے متعلق تمام تر امور کا اہتمام شبلی کے سپرد کر دیا اور دس ہزار روپے کی رقم بطور معاوضہ بالاقساط یا یکمشت ادا کرنا منظور کیا۔ ٹائپ کے درآوردخط میں سات ہزار صفحات پر مشتمل اس کتاب کے ترجمے کے لیے شبلی نے تین برس کا وعدہ کیا۔ بعد ازاں شبلی نے مولانا حمید الدین فراہی کو بھی اس کام میں شامل ہونے کی دعوت دی، حتیٰ کہ وہ اپنی نگرانی میں سارا کام فراہی صاحب کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔

اس سارے منصوبے کی تفصیل مولانا حمید الدین فراہی کے نام ۳؍جولائی ۱۸۹۹ء اور ۱۸؍جولائی ۱۹۰۰ء کے خطوں میں اور نواب سید علی حسن خاں کے نام ۹؍اگست ۱۸۹۹ء کے خط میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔[۲۰]

ایک تو یہ مجوزہ کام ترجمے پر مشتمل تھا، دوسرے یہ ترجمہ مولانا حمید الدین فراہی کے سپرد کر دینے کا ارادہ تھا اور حتمی بات یہ کہ یہ سارا منصوبہ روبعمل ہی نہ ہو سکا، اس لیے اسے موعودہ کتب میں شامل کرنے کا کوئی جواز نہ تھا، لیکن چونکہ اس کی اشاعت کی صورت میں اس پر شبلی کا نام بھی درج ہوتا اور اسے شبلی کے علمی کاموں میں شمار کیا جاتا، اس لیے اس علمی منصوبے سے آگاہی ناگزیر تھی۔

دیکھنا یہ ہے کہ شبلی اتنے منصوبے پایۂ تکمیل کو کیوں نہ پہنچا سکے؟ بلاشبہ علامہ شبلی نے بھرپور علمی زندگی بسر کی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے ذہن میں خیالات اتنی تیزی سے جنم لیتے تھے کہ وہ سب کو معرضِ تحریر میں نہ لا سکے۔ وہ ان خیالات کے بارے میں نہایت پُرجوش انداز میں مطلع کرتے ہیں، ان کا اعلان کرتے ہیں اور پھر بعض کا آغاز بھی کرتے ہیں؛ لیکن اکثر مکمل نہیں ہو پاتے؛ چنانچہ ان کے ہاں پایۂ تکمیل کو پہنچنے والی تصانیف کی نسبت موعودہ کتب کی تعداد اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں اور اگر شبلی تمام موعودہ کتب لکھنے پر قادر ہو سکتے تو یقیناً ان کے علمی مقام و مرتبے میں کئی گنا مزید اضافہ ہو جاتا۔ بہر حال، موجودہ صورت میں بھی ان کی علمی و ادبی حیثیت مسلّم ہے۔

۱۔ سید سلیمان ندوی: مکاتیبِ شبلی دوم، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، ۱۹۱۷ء، ص ۲۷۸
۲۔ شبلی نعمانی بنام مولوی محمد عمر (فارسی)، ۱۸۸۲/۱۰/۷ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۲۷۸-۲۷۹
۳۔ مشمولہ خالد ندیم: اردو ترجمہ مکاتیبِ شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۶ء، ص ۳۰
۴۔ شبلی نعمانی بنام مولوی محمد سمیع، ؟/؟/۱۸۸۳ء، مکاتیبِ شبلی اول، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، ۱۹۱۶ء، ص ۵۴
۵۔ شبلی نعمانی بنام مولوی محمد سمیع، ۹؍اپریل ۱۸۸۴ء، مکاتیبِ شبلی اول، ص ۴۷
۶۔ شبلی نعمانی بنام مولوی محمد سمیع، ۲۷؍نومبر ۱۸۸۴ء، مکاتیبِ شبلی اول، ص ۴۸
۷۔ سید سلیمان ندوی: مکاتیبِ شبلی اول، ص ۴۷
۸۔ شبلی نعمانی: دیباچہ المامون، دہلی: افضل المطابع، طبع پنجم ۱۸۸۹ء، ص ۴
۹۔ شبلی نعمانی: دیباچہ المامون، ص ۵
۱۰۔ شبلی نعمانی: سفرنامۂ روم و مصر و شام، دہلی: قومی پریس، طبع اول ۱۸۹۲ء، ص ۱۳
۱۱۔ شبلی نعمانی بنام سید احمد مرتضیٰ نذر، ۱۵؍ستمبر ۱۹۱۰ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلی اول، ص ۳۲۶-۳۲۷
۱۲۔ شبلی نعمانی: دیباچہ سیرۃ النعمان، آگرہ: مطبع مفید عام، طبع دوم ۱۸۹۲ء، ص ۴
۱۳۔ شبلی نعمانی بنام مولوی سید ممتاز علی، ۲۱؍اکتوبر ۱۸۹۲ء، مشمولہ مکتوباتِ شبلی مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، اعظم گڑھ: ادبی دائرہ، ۲۰۱۲ء، ص ۷۱

۱۴۔ شبلی نعمانی بنام مولانا ابوالکلام آزاد، یکم دسمبر ۱۹۰۹ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلی اوّل، طبع جدید ۱۹۱۰ء، ص ۲۵۲

۱۵۔ شبلی نعمانی بنام سید احمد مرتضیٰ نذر، ۶ ستمبر ۱۹۱۰ء، مکاتیبِ شبلی اوّل، ص ۳۲۶

۱۶۔ شبلی نعمانی: 'محقق' مطبوعہ الندوہ لکھنؤ، جون ۱۹۰۵ء، بحوالہ مقالاتِ شبلی پنجم، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، طبع جدید ۲۰۰۷ء، ص ۷۳

۱۷۔ شبلی نعمانی بنام منشی شرف الدین رام پوری، مرقومہ ۲۹ دسمبر ۱۸۹۲ء، مکاتیبِ شبلی اوّل، ص ۳۲۷

۱۸۔ شبلی نعمانی بنام مہدی افادی، ۱۱ مئی ۱۹۰۲ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۲۳۱-۲۳۲

۱۹۔ شبلی نعمانی بنام مولانا حمید الدین فراہی، ۹ مارچ ۱۹۰۳ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۱۵

۲۰۔ مکاتیبِ شبلی دوم، صفحات بالترتیب ۱۰۸-۱۱، ۱۹۴

□□□

اردو کی ادبی تواریخ میں ذکرِ شبلی

شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کا نام اردو زبان و ادب کی تاریخ ایک رجحان ساز ادیبوں میں شامل ہے۔ اگرچہ وہ اردو کے عظیم انشاپردازوں کے دور میں پیدا ہوئے اور سرسید احمد خاں (پ: ۱۸۱۷ء)، مولانا محمد حسین آزاد (پ: ۱۸۳۰ء)، ڈپٹی نذیر احمد (پ: ۱۸۳۶ء) اور مولانا حالی (پ: ۱۸۳۷ء) جیسے ناموروں کی نسبت صغیر سن بھی تھے، لیکن انھوں نے موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے اپنے لیے الگ جگہ بنائی۔ اب جب کہ ان کے مقام و مرتبے کا تعین اور ان کی علمی و ادبی خدمات کی قدر و قیمت کا تعین ہو چکا ہے اور انھیں بجا طور پر اردو ادب کی نابغہ روزگار شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے، اردو ادب کی تاریخوں میں ان کے بارے میں پیش کی جانے والی آرا کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد محض یہ ہے کہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات پر تصانیف اور مضامین سے قطع نظر اردو کے ادبی مؤرخین کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ مصنف یا مضمون نگار بالعموم اپنے موضوع سے سروکار رکھتا ہے، جب کہ ادبی مؤرخ کو ساری تاریخ کے درمیان رہ کر سوچنا پڑتا ہے، چنانچہ مصنف و مؤرخ کے ہاں کسی شخصیت اور اس کے کارناموں سے متعلق ایک مختلف رویہ سامنے آتا ہے۔

اردو ادب کی اب تک لکھی گئی تاریخوں میں تاریخ ادبِ اردو (رام بابو سکسینہ، مترجمہ مرزا محمد عسکری)، داستانِ تاریخ ادب (حامد حسن قادری)، تاریخ ادبیاتِ اردو (ڈاکٹر

ابوسعید نورالدین)، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (ڈاکٹر سلیم اختر)، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (سید احتشام حسین)، اردو ادب کی مختصر تاریخ (ڈاکٹر انور سدید)، اردو ادب کی تاریخ (ڈاکٹر تبسم کاشمیری) اور تاریخ ادب اردو (ڈاکٹر جمیل جالبی) نمایاں ہیں۔

(۱)

علامہ شبلی کے وفات کے تیرہ برس بعد ۱۹۲۷ء میں شائع ہونے والی رام بابو سکسینہ کی *History of Urdu Literature* (تاریخ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری) 'حصہ نظم' اور 'حصہ نثر' میں منقسم ہے، البتہ دونوں حصوں کے ابواب کو مسلسل رکھا ہے۔ یوں یہ تاریخ 'حصہ نظم' کے چودہ ابواب سمیت کل انیس ابواب پر مشتمل ہے، جن میں سے سولہویں باب 'نثر اردو کا دور متوسط اور دور جدید' میں علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور فن پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ بحث 'تعلیم اور ابتدائی مشاغل'، 'قیام علی گڑھ'، 'ابتدائی تصانیف'، 'قیام حیدرآباد'، 'ندوۃ العلما'، 'دارالمصنفین اعظم گڑھ'، 'قابلیت اور خدمات کا اعتراف'، 'اخلاق و عادات'، 'تصانیف'، 'مولانا بحیثیت مورخ کے'، 'مولانا بحیثیت ناقد کے' اور 'طرز تحریر' کے عنوانات میں تقسیم ہے۔

اگر چہ دس صفحات میں کوئی جامع مقالہ نہیں لکھا جا سکتا اور کسی شخصیت اور اس کے فکر وفن کا بالتفصیل تجزیہ ممکن نہیں، لیکن علامہ شبلی سے متعلق سکسینہ کی چند آرا ایسی ہیں، جو آج بھی شبلی شناسی میں اہمیت رکھتی ہیں۔ سکسینہ لکھتے ہیں:

۱۔ شبلی نعمانی اپنے زمانے کے مشہور ترین و قابل ترین بزرگوں میں تھے۔ نہایت کثیر الاشواق اور جامع الاذواق تھے۔ اگر کوئی شخص ایک شاعر، فلسفی، مورخ، ناقد، ماہر تعلیم، معلم، واعظ، رفارمر، جریدہ نگار، فقیہ، محدث، سب کچھ ہو سکتا ہے تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی کہ انھوں نے ان سب کمالات مختلفہ اور علوم وفنون متنوعہ کا اپنی ذات میں اجتماع کر لیا تھا۔[۱]

۲۔ جس طرح سے مولانا نے نکات تنقید بطرز مغرب آرنلڈ صاحب سے حاصل کیے ہوں گے؛ اسی طرح انصافاً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر صاحب اپنی کتاب *The Preaching of Islam* کی اکثر باتوں کے لیے مولانا کے ممنون ہیں۔[۲]

۳۔ اگر کسی شخص کو زمانہ حال کی کوئی ایسی تصنیف دیکھنا ہو، جو وسعت مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور سلاستِ زبان کا ایک بہترین مجموعہ کہی جا سکے تو اس کو شعر العجم دیکھنا چاہیے...... یہ سچ ہے کہ مولانا کے انتقال کے بعد اس کی اکثر غلطیاں نکالی گئیں اور وہ ایک جارحانہ نظر سے دیکھی جارہی ہے، مگر پھر بھی ہمارے نزدیک، کتاب کی قدر و قیمت اور مولانا کے تبحر علمی میں اس سے کوئی فرق نہیں آسکتا۔ کتاب مذکور نظم فارسی کی ایک مکمل تاریخ اور نہایت سلیس اور دلچسپ زبان میں ہے۔[۳]

۴۔ موازنہ انیس و دبیر بھی ایک بہت بیش قیمت تصنیف ہے اور گو کہ اس سے بھی اختلاف کیا گیا اور بعض کتابیں اس کے جواب میں نکلیں، مگر پھر بھی اس کی اکثر باتیں کارآمد اور صحیح ضرور ہیں۔[۴]

۵۔ مولانا ہمیشہ صفائی اور سادگی اور وضاحتِ کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کی عبارت میں کبھی گنجلک نہیں ہوتی، اس میں ایک خاص چمک اور تڑپ ہوتی ہے۔...... مولانا کے یہاں صنائع بدائع اور عبارت میں تکلف بہت کم ہوتا ہے اور گو کہ اکثر جگہ فصاحت اور زور بیان مضمون میں چار چاند لگا دیتا ہے، پھر بھی نفس مطلب نہایت واضح رہتا ہے۔ یہ بڑی قابل تعریف بات ہے کہ مختلف انواع تحریر کے لیے مولانا اسی کے مناسب حال انداز بیان بھی اختیار کرتے ہیں۔[۵]

سکسینہ کی ان تنقید آرا سے اردو تنقید آج بھی مستفیض ہو رہی ہے؛ البتہ ان کے ہاں بعض تحقیقی تسامحات در آئے ہیں، جن کی نشان دہی ضروری خیال کی جاتی ہے۔

۱۔ سکسینہ نے لکھا ہے کہ '۱۸۸۲ء میں اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے ملنے کے لیے، جو علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے، علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا'[۶] حالانکہ یہ واقعہ اکتوبر ۱۸۸۱ء کا ہے۔ سکسینہ نے جس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کا تعلق شبلی کے دوسری مرتبہ علی گڑھ

جانے سے ہے، جس کے نتیجے میں وہ جنوری ۱۸۸۳ء کے آخر میں چالیس روپے ماہوار پر علی گڑھ کالج میں اسسٹنٹ عربک پروفیسر مقرر ہوئے۔

۲۔ سکسینہ نے لکھا ہے کہ '۱۸۸۴ء میں مثنوی صبح اُمید کا ستارہ مولانا کے افقِ تصنیف پر جلوہ گر ہوا'[۷] حالانکہ یہ مثنوی ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔[۸] یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مؤلف حیاتِ شبلی نے اس مثنوی کا سالِ اشاعت ۱۸۸۵ء درج کیا ہے۔[۹]

۳۔ سکسینہ کے خیال میں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ۱۸۸۶ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں بطور ایڈریس پیش کی گئی تھی، ۱۸۸۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی[۱۰] جب کہ مؤلفِ حیاتِ شبلی کے مطابق لکھنؤ میں منعقدہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس منعقدہ ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۷ء میں پڑھا گیا[۱۱] اور اس کی اشاعت ۱۸۸۸ء میں عمل میں آئی۔[۱۲]

۴۔ سکسینہ کے یہ کہنے سے کہ '[شبلی نے] ۱۸۹۲ء میں سفرِ روم و شام اختیار کیا، جس میں پروفیسر آرنلڈ بھی ان کے ہمراہ تھے'[۱۳] یہ خیال گزرتا ہے کہ شبلی نے یہ سیاحت ان کی معیت میں کی، حالانکہ آرنلڈ کا ساتھ یکم مئی سے ۱۴ر مئی تک ۱۸۹۲ء تک رہا، اس کے بعد شبلی پورٹ سعید پر اُتر گئے اور آرنلڈ اسی جہاز پر یورپ روانہ ہوئے۔[۱۴]

حیرت ہے کہ سکسینہ شبلی کی شاعرانہ خصوصیات کو نظر انداز کر گئے اور تاریخ کے 'حصہ نظم' میں ان کا نام تک نہ لیا؛ البتہ زیرِ نظر حصے میں 'مولانا بحیثیت ناقد کے' میں انھیں 'شاعرِ شیریں مقال'[۱۵] کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

(۲)

حامد حسن قادری (۱۸۸۷ء۔۱۹۶۴ء) کی داستانِ تاریخِ اردو کی تالیف کا آغاز ۱۹۳۸ء میں ہوا، ۲۳ر ستمبر ۱۹۴۱ء کو اس کا دیباچہ لکھا گیا اور نومبر ۱۹۴۱ء میں یہ کتاب آگرہ سے بابو لکشمی نرائن نے شائع کردی۔ مصنف کو اس تالیف کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعض حصوں کے نامکمل رہ جانے کا اعتراف ہے۔[۱۶] جب اس کے دوسرے

اڈیشن کی نوبت آئی تو مصنف کو عافیت اسی میں نظر آئی کہ کتاب جیسی کچھ ہے، دوبارہ چھپوا دی جائے؛ چنانچہ نظرِ ثانی میں درستی و ترمیم اور حذف و اضافہ کرتا گیا اور پچاس پچاس سو سو صفحے چھپنے کے لیے بھیجتا گیا۔[۱۷] آخر ۱۹۵۷ء میں یہ کتاب آگرہ ہی سے دوبارہ چھپ گئی۔ کتاب کا تیسرا اڈیشن ۱۹۶۳ء اور چوتھا ۱۹۸۸ء میں اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوا۔ واضح رہے کہ چوتھا اڈیشن تیسرے اڈیشن کی مکرر اشاعت ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کے خیال میں، اگرچہ یہ انیسویں صدی کے اختتام تک ہی کے مصنفوں کا احصا کرتی ہے، لیکن تا حال یہ اردو نثر نگاروں کی بہترین تاریخ ہے۔[۱۸] چنانچہ 'مستشرقین اور عہد سرسید کے اردو کے عناصرِ خمسہ کا بیان آج بھی قابلِ قدر ہے'[۱۹] اور 'مختلف نثر نگاروں کے حالات اور ان کی تصانیف کے بارے میں اس تاریخ پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔'[۲۰] ڈاکٹر گیان نے رام بابو سکسینہ کی تاریخ کے بعد اسے اردو نثر کی دوسری قابلِ قدر تاریخ قرار دیا ہے۔[۲۱]

داستانِ تاریخِ اردو ابتدائی دو ابواب (آغازِ اردو سے پہلے اردو زبان، آغازِ اردو) کے بعد نثر کے چھ ادوار کا احاطہ کرتی ہے۔ ان چھ نثری ادوار میں سے شبلی نعمانی کا ذکر 'نثر کا چھٹا دور (غدر کے بعد)' میں ہوا ہے۔ کتاب کے صفحہ ۷۱۸ سے صفحہ ۹۰۰ تک ۱۸۳ر صفحات بنتے ہیں، گویا یہ کسی باب کا حصہ نہیں، بلکہ ایک مکمل کتاب قرار دی جاسکتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اسے علیحدہ سے کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو یہ احساس بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ کسی کتاب سے مستعار ہے۔

حامد حسن قادری نے شبلی کی پیدائش سے ان کی وفات تک تیرہ صفحات پر نہایت جامع گفتگو کی ہے۔ سید سلیمان ندوی کی حیاتِ شبلی اس کتاب کے پہلے اڈیشن کے دو سال بعد شائع ہوئی۔ داستانِ تاریخِ اردو کے مابعد اڈیشنوں میں اگرچہ ترمیم و اضافہ ہوتا رہا، لیکن مصنف نے حیاتِ شبلی سے استفادہ ضروری خیال نہ کیا۔ اگرچہ بعض ضروری امور نظر انداز

ہو گئے، تاہم سوانح شبلی سے متعلق تمام بنیادی معلومات فراہم ہو گئی ہیں۔

'علامہ کے اخلاق و عادات'، 'علامہ شبلی کے مذہبی خیالات' اور 'سیاسی خیالات و قومی خدمات' میں مصنف نے مولوی حبیب الرحمٰن شروانی، مولوی عبدالحلیم شرر اور خواجہ غلام الثقلین کی تحریروں سے طویل اقتباس دیے ہیں، لیکن تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا، جس سے معلوم ہو کہ خود مصنف کا نقطہ نظر کیا ہے۔

'علامہ شبلی کی تصانیف' میں مصنف نے نوعیت کے اعتبار سے شبلی کے جملہ تصانیف کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ساتھ اُن تصنیفی منصوبوں سے روشناس کرایا ہے، جو باجود رُو بعمل نہ آ سکے۔ ان کا درج ذیل بیان ان کی تنقیدی اور تاریخی بصیرت کا ترجمان ہے:

> امام صاحبؒ کے سوانح (سیرۃ النعمان) لکھنے میں علم کلام کی بحث اور امام ابوحنیفہؒ کا اس سے تعلق سامنے آ گیا...... علامہ شبلی نے تمام 'کلام' اور 'کلامیوں' کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس دلچسپی میں وہ 'سلسلہ فرماں روایات اسلام' ہاتھ سے چھوٹ گیا۔...... اور یہ بہت اچھا ہوا۔ 'ملک شاہ سلجوقی' اور 'نورالدین زنگی' وغیرہ کو لکھ بھی دیتے تو بجز 'تالیف شبلی' کے اور کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی۔ یہ بات اسی سے معلوم ہوتی ہے کہ علامہ کی تمام تصانیف میں المامون سب سے کم پڑھی جاتی ہے۔[32]

شبلی کے طرزِ تحریر پر بات کرتے ہوئے وہ روایتی تراکیب، یعنی 'لطیف و نازک استعارہ و تشبیہ'، 'حسن تناسب'، 'لطافتِ خیال'، 'قوتِ استدلال'، 'ندرت و جدت'، 'حسن نظر' اور 'ذوقِ سلیم' وغیرہ سے کام لیتے ہیں؛ البتہ ان کا یہ کہنا بہت اہم ہے کہ 'علامہ شبلی اپنے زمانہ کے پہلے شخص [تھے]، جنھوں نے اسلوبِ تحریر کی اہمیت کو سمجھا'۔[33]

انھیں نے سب سے پہلے اوّلیاتِ شبلی کی نشاندہی کی۔ سوانح نگاری میں محمد حسین آزاد کی دربارِ اکبری اور حالی کی حیاتِ سعدی اور تنقید میں آزاد کی آبِ حیات و سخن دانِ فارس اور حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے باوجود سیرت النبیؐ، الفاروق، شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر کو 'سیرت' و 'تنقید' میں شبلی کی اوّلیات قرار دیتے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ 'جب شبلی نے ان چیزوں پر قلم اٹھایا تو اس زمین کو آسمان کر دیا'۔[24] اسلام کے عقائد و اعمال اور احکام و شرائع کو عقل کے مطابق اور مصلحتِ زمانہ پر مبنی ثابت کرنے میں سرسید اور ان کی تقلید میں مولوی چراغ علی کی اوّلین کوششوں کے باوصف، وہ سمجھتے ہیں کہ 'اس فن کی تاریخ و اصول اور اہلِ فن کا طریقہ عمل سب سے پہلے علامہ شبلی نے پیش کیا'۔[25] چنانچہ علم الکلام، الکلام، الغزالی اور سوانح مولانا روم کو اس فن کی اوّلیات قرار دیتے ہیں اور آخریات بھی۔[26] اسی سلسلے میں وہ مثنوی مولانا روم سے علمِ کلام کے مسائل کی ترتیب کو علامہ کی جودتِ طبع اور فکرِ رسا کا ثبوت قرار دیتے ہیں۔ شبلی کی اوّلیات کی بابت ان کا یہ تجزیہ قابلِ ذکر ہے:

> ان تمام تصانیف میں 'بلاغتِ کلام' جس حد تک ہے، اس میں کوئی ہم عصر شبلی کو نہیں پہنچا؛ اس لیے وہ ادیب و نقاد اور مؤرخ و سیرت نگار، ہر حیثیت سے رفعتِ مرتبت میں بالکل منفرد ہیں۔[27]

شبلی کی شاعری پر بات کرتے ہوئے، ان کے آخری دَور کے فارسی کلام کو 'کلام بہت منجھا ہوا اور معیار سے قریب' قرار دیتے ہیں اور فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں کہ 'اُس زمانے میں ان سے زیادہ پُرگو اَور بھی تھے، زیادہ شیریں کلام کوئی نہ تھا'۔[28] دوسری جانب اردو شاعری میں وہ انھیں قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔

شبلی سے متعلق اس تاریخ کا ایک بڑا کارنامہ علامہ شبلی پر اعتراضات اور ان کا تجزیہ ہے۔ ان کی نوعیت دو طرح کی ہے، اجتہادی اور تحقیقی و تنقیدی۔ اجتہادی نقطہ نظر سے شبلی پر وارد ہونے والے اعتراضات پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا:

> سرسید باقاعدہ عالم، محدث، فقیہ نہ تھے اور علامہ شبلی سب کچھ تھے۔ سرسید کی رایوں کو تو 'دخل در معقولات' سمجھا گیا تھا، لیکن علامہ شبلی کے 'اجتہادِ نو' کی حمایت میں ان کے جبہ و دستار تھے؛ علمائے ملت کی برہمی و برافروختگی کا یہی باعث تھا۔[29]

تحقیقی و تنقیدی نوعیت سے سیرۃ النعمان، الفاروق، موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم پر

بعض سوالات اٹھائے گئے ہیں، جن میں سے بعض پر مصنف نے مفصل گفتگو کی ہے اور اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ موازنہ پر بھرپور بحث کے بعد مصنف نے لکھا ہے:

> موازنہ کا حق یہ تھا کہ علامہ، مرزا [دبیر] صاحب کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے، بجائے ایک دو واقعات یا چند اشعار کے، وہ تمام یا اکثر حصے پیش کرتے، جہاں دبیر انیس سے بڑھ کر یا برابر کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ہوتا تو پھر ان سے کوئی شکایت نہ ہوتی اور ترجیح انیس کے متعلق ان کی رائے پھر بھی درست ہی رہتی۔[۳۰]

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اور حافظ محمود شیرانی نے شعرالعجم کی تحقیقی غلطیوں پر سخت گرفت کی، البتہ مصنف کا کہنا ہے:

> مختلف لوگوں نے مضامین اور رسالے لکھ کر اس کی تاریخی و تنقیدی غلطیاں دکھائیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی مؤرخ سے زیادہ نقاد تھے۔ شعرالعجم کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ فارسی شاعری کی وسعت و جامعیت ثابت کی جائے اور تنقید و موازنہ کر کے شاعروں کے کمالات دکھائے جائیں۔ اس کام کے لیے فی الجملہ ملکی تاریخ اور شاعری کا ارتقا بھی بیان کرنے کی ضرورت تھی اور شاعروں کے حالات بھی، لیکن ذاتی حالات یا ملکی تاریخ مقصود بالذات نہ تھی۔[۳۱]

اس تاریخ میں دوسری تمام تواریخ کے مقابلے میں شعرالعجم کے حوالے سے پروفیسر براؤن کی ادبی تاریخ ایران پر شبلی کے بیان پر تبصرہ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ شبلی کی طرف سے براؤن کی تاریخ کو 'عامیانہ اور سوقیانہ' قرار دینے پر مصنف نے سخت تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ شبلی کا بیان درست نہیں ہے۔ مصنف نے شبلی کے مذکورہ تبصرے کے برعکس پروفیسر براؤن کی 'انصاف پسندی اور کشادہ دلی' کی تعریف کی ہے اور شعرالعجم کے منظرِ عام پر آنے کے بعد براؤن کی طرف سے اپنی تاریخ کی آئندہ جلد میں شعرالعجم سے استفادے اور شبلی کے بعض بیانات کی تحسین کا ذکر کیا ہے۔[۳۲]

اس تاریخ کا ایک اہم وصف 'تصانیفِ شبلی کے نمونے' ہے، جس میں المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، سفرنامہ روم و مصر و شام، الغزالی، علم الکلام، الکلام، سوانح مولانا

روم، موازنۂ انیس و دبیر، شعرالعجم، سیرت النبیؐ، رسائل و مقالات، مقالاتِ شبلی اور مکاتیب و خطوط سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ مصنف نے محض اقتباسات پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ہر کتاب کا تصنیفی پس منظر بھی بیان کیا گیا ہے اور اس تصنیف کی قدر و قیمت پر بھی بحث کی گئی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ یہ کام [المامون] حقیقت میں نہایت دشوار ہے، لیکن علامہ شبلی نے اپنے علم و فضل، وسعتِ مطالعہ سے اور اس سے زیادہ اپنے ذوقِ صحیح اور دقتِ نظر سے ایسی خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ اردو میں اس سے بہتر نمونہ موجود نہ تھا۔[۳۳]

۲۔ [سیرۃ النعمان کی] کی ترتیب و تالیف میں علامہ کی جدت اور مسائل کے فیصلہ و محاکمہ میں ان کا اجتہاد شامل ہے۔ یہی اجتہاد علامہ اور علما کے درمیان اختلاف کا باعث ہوا تھا۔[۳۴]

۳۔ باوجود اعتراضات کے، الفاروق ایسی جامع و مکمل کتاب تالیف ہوئی ہے کہ کسی زبان میں اس کا جواب موجود نہ تھا۔ خود علامہ کی ادبیت الفاروق میں پہلی سب کتابوں سے بہتر ہے۔[۳۵]

۴۔ ان کے ذہنِ رسا اور دقتِ نظر نے کلامِ انیس کا جیسا تجزیہ و تبصرہ کیا ہے؛ جو نکتے نکالے ہیں، جو موازنے کیے ہیں؛ وہ دوسرے [سرے؟] سے مشکل تھے۔[۳۶]

۵۔ یہ تمام مضامین [مقالاتِ شبلی] علامہ شبلی کے زورِ قلم، قوتِ استدلال، وسعتِ تحقیق اور دقتِ نظر کے شاہد ہیں۔ بعض جگہ ان کی رائے و نظریہ سے اختلاف ہو سکتا ہے، کہیں کہیں تحقیق میں جانب داری بھی پائی جاتی ہے؛ لیکن یہ جزئی باتیں ہیں، اس لیے لائقِ اعتنا نہیں۔ علامہ نے بعض ایسے مضامین (مثلاً تاریخی) پر قلم اٹھایا ہے، جن کی طرف اُن سے پہلے کسی کی توجہ نہ ہوئی تھی اور جن کی اہمیت آج بھی مسلّم ہے۔[۳۷]

حامد حسن قادری نے شبلی سے متعلق جو رائے قائم کی ہے، اس میں دوسروں کے تعصبات کا کوئی دخل نہیں، اور یہی اس تاریخ کی سب سے بڑی خاصیت قرار دی جا سکتی ہے؛ مثلاً انھوں نے خطوطِ شبلی کی ذیل میں منشی محمد امین زبیری اور مولوی عبدالحق کے خیالات

کو نقل کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ 'لوگوں کی ستم ظریفی ہے کہ مرے ہوؤں کے گھر کے بھید اور دل کی باتیں سر بازار تشہیر کر دیتے ہیں اور 'ستم ظریفی' کا لفظ اگر کہیں صادق آ سکتا ہے تو اس کا بہترین محل یہ خطوطِ شبلی ہیں۔'[۳۸] چنانچہ مصنف نے 'محبت و خلوص'، 'فارسی پڑھانے کا شوق'، 'موسیقی سکھانے کا شوق'، 'عورتوں کے اوصاف علامہ کی نظر میں' اور 'اپنی تصانیف اور شاعری کے متعلق' عنوانات کے تحت خطوطِ شبلی سے اقتباسات پیش کیے، لیکن کسی رائے اور تبصرے کے بغیر۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، داستانِ تاریخ اردو کا زیر بحث حصہ بجائے خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے مطالعے سے شبلی سے متعلق تمام تر بنیادی معلومات، ان کے علمی و ادبی کارناموں سے شناسائی، ان کی قدر و قیمت اور اسلوب کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

(۳)

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین کی تاریخ ادبیاتِ اردو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کی طرف سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی، لیکن جیسا کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اس تالیف کا تعارف ۵/مارچ ۱۹۶۹ء کو لکھا گیا، اس لیے ضروری ہے کہ کتاب اس سے پہلے پایہ تکمیل کو پہنچ چکی ہو۔ خود مصنف نے ۱۵/ستمبر ۱۹۸۹ء کو لکھے گئے دیباچہ کتاب میں یہ کہہ کر اس بات کی تصدیق کی ہے کہ 'پیش نظر کتاب ایک تحریک کے ماتحت بہت پہلے لکھی گئی تھی، لیکن اس کی اشاعت میں بڑی تصویق پیش آئی، جو خلاف توقع تاخیر کا باعث ہوئی'۔[۳۹] بہر حال، ۱۹۶۹ء یا اس سے قبل لکھی ہوئی یہ کتاب نظر ثانی کے بعد ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آئی۔

یہ کتاب دو حصوں، یعنی حصہ اوّل 'اردو نثر' اور حصہ دوم 'اردو نظم' پر مشتمل ہے اور دونوں حصے الگ الگ جلد کی صورت میں شائع ہوئے۔ پہلی جلد پانچ ابواب میں منقسم ہے، جس میں سے علامہ شبلی باب چہارم 'اردو نثر میں اصلاحی اقدام' میں زیر بحث آئے ہیں۔

ابوسعید لکھتے ہیں کہ 'تاریخ، تحقیق اور تنقید سب معاملے میں مَیں نے قابلِ اعتماد

تحقیقات اور تنقیدی رویوں سے فائدہ اٹھایا ہے؛ البتہ حسب ضرورت جگہ جگہ اپنے خیالات اور رویوں کا اظہار کیا ہے، بالخصوص تبصروں کی شکل میں جو کچھ لکھا ہے، وہ سب ہی اپنے خیالات ہیں۔'[۴۰] چنانچہ زیر بحث حصے میں بھی مؤلف نے یہی انداز اپناتے ہوئے شبلی نعمانی کے سوانحی کوائف درج کیے ہیں؛ البتہ 'ادبی زندگی' کی ذیل میں تصانیفِ شبلی کے تجزیاتی مطالعے میں انھوں نے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس حصہ باب میں ابوسعید اوّل اوّل کتاب کا تعارف، بعض ناقدین کی رائے اور اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں، ساتھ ساتھ نمونہ عبارت بھی اقتباس کرتے ہیں۔ الفاروق پر ان کا تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

> مولانا شبلی کی الفاروق لاجواب کتاب ہے۔ اردو میں کیا، کسی زبان میں بھی اس پایے کی کتاب موجود نہ تھی۔ اس کے بعد اردو میں دوسرے علما نے حضرت عمر فاروقؓ پر چھوٹی بڑی کئی سوانح عمریاں لکھی ہیں، لیکن سب مولانا شبلی کے زلہ خوار معلوم ہوتے ہیں۔[۴۱]

سفرنامۂ روم و مصر و شام کے تحت ابوسعید کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ 'پروفیسر آرنلڈ بھی ساتھ تھے، لیکن وہ مولانا کو راستہ میں ہی چھوڑ کر ولایت جانے کے لیے آگے بڑھ گئے'،[۴۲] حالانکہ آرنلڈ اسی ارادے سے عازم سفر ہوئے تھے اور شبلی نعمانی اس سے باخبر تھے۔ اس سفرنامے کے بارے میں مؤلف کا یہ کہنا بھی بحث طلب ہے کہ 'یہ کتاب مولانا کا کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں ہے۔ اس میں ایک طالب العلمانہ تلاش اور جستجو پائی جاتی ہے۔'[۴۳]

موازنۂ انیس و دبیر پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ شبلی نے میر انیس کو مرزا دبیر پر زبردستی ترجیح دی ہے، ابوسعید نے بجا لکھا ہے کہ 'موازنۂ انیس و دبیر میں جو خوبیاں بیان ہوئی ہیں، ان کے مقابلے میں یہ اعتراض کوئی وقعت نہیں رکھتا'۔[۴۴] ان کے خیال میں 'مولانا شبلی کی یہ کتاب اردو میں اپنی قسم کی پہلی اور بہترین ہے'۔[۴۵]

عطیہ فیضی کے حوالے سے انھوں نے لکھا:

> ان کو ہم نے ۱۹۶۰ء کے درمیان کے سالوں میں دیکھا ہے...... ان کی زندہ دلی

> اور شوخی طبع اُن دِنوں میں بھی غضب کی تھی۔ ان کو دیکھ کر ہمیں مولانا شبلی اور علامہ اقبال یاد آتے تھے۔ ان کی وجہ سے مولانا شبلی کافی بدنام بھی ہوئے، علامہ اقبال کے بارے میں بھی بعض لوگوں کو بدگمانی رہی۔[۴۶]

درج بالا بیان کے پس منظر میں طنز کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جس کا تعلق کسی مؤرخ، محقق یا نقاد سے نہیں ہوسکتا۔

شبلی کی نثری خدمات کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے جن چند نکات سے شبلی کی انفرادیت کا اظہار کیا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ ان کی نثر شگفتہ، بلکہ دلفریب ہے، اس میں دلربائیاں پائی جاتی ہیں، ان کی عبارت میں عالمانہ شان ہونے کے باوجود دلکشی اور جاذبیت قائم رہتی ہے۔ ان کی تحریروں میں انقباض نہیں، بلکہ ہر جگہ انبساط ہے۔ پڑھنے سے دماغ کو تسکین اور دل کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔[۴۷]

۲۔ سرسید کی صحبت سے انھوں نے جدید دَور کے تقاضے کو محسوس کیا اور اس کے نئے رجحانات سے واقف ہوئے، لیکن انھوں نے مولانا حالی کی طرح اپنے آپ کو سرسید میں مدغم نہیں کیا اور اپنی شخصیت کو برابر ان سے الگ تھلگ ہی رکھا۔[۴۸]

۳۔ موضوع کے اعتبار سے مولانا شبلی اوّل درجے کے سوانح نگار ہیں، اس کے بعد وہ ایک مؤرخ بھی ہیں اور متکلم بھی، ایک نقاد بھی ہیں اور انشاپرداز بھی۔[۴۹]

۴۔ سوانح نگاری میں مولانا حالی کو اوّلیت حاصل ہے، لیکن مولانا شبلی نے اس صنفِ ادب کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔ سیرت النبیؐ، سوانح مولانا روم اور الفاروق لکھ کر انھوں نے جو دادِ تحقیق دی ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔[۵۰]

۵۔ علم الکلام کا انداز بھی ان سے پہلے سرسید نے ڈال دیا تھا، لیکن مولانا شبلی نے اس میں وسعت نظر اور دِقت نظر سے کام لیا۔ ان کی خدمات سید کے مقابلے میں اس صنفِ علم میں زیادہ ہیں۔[۵۱]

۶۔ تنقید میں مولانا نے موازنۂ انیس ودبیر اور شعرالعجم لکھ کر جو خدمات انجام دیں، وہ بہت ہی قابلِ قدر ہیں۔[۵۲]

۷۔ بحیثیت مؤرخ کے، مولانا شبلی کا درجہ ذرا گھٹا ہوا ہے۔ تاریخی واقعات کی غلطیاں ان کی کتابوں میں کافی پائی جاتی ہیں۔[۵۳]

۸۔ مولانا شبلی کو مؤرخ کے بجائے ایک کامیاب سوانح نگار قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ بنیادی طور پر ایک سوانح نگار تھے، ان کی دوسری تمام حیثیات ثانوی درجہ رکھتی ہیں۔[۵۴]

درج بالا تنقیدی آرا سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ شبلی کی ادبی خدمات کے بارے میں یہ آرا قابلِ توجہ ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ 'اردو نظم' پر مشتمل ہے، جو باب ششم سے باب دہم، پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ شبلی نعمانی کا تذکرہ باب نہم 'اردو نظم میں اصلاحی اقدام' میں مولانا حالی اور اسماعیل میرٹھی کے درمیان ملتا ہے۔ محض دو صفحات پر مشتمل اس تذکرے کا نصف حصہ کلامِ شبلی سے اقتباس سے مزین ہے اور باقی عبارت تبصرے کی ذیل میں آتی ہے۔ ان کے ہاں سے تین اقتباس دیے جاتے ہیں، جن سے ان کے تنقیدی نتائج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

۱۔ مولانا شبلی کو اسلام اور مسلمانوں سے عشق تھا۔ انھوں نے مذہبی اور قومی شاعری کو بڑی ترقی دی، بعض موقعوں پر پوری پوری مذہبی روایتیں نظم کر دی ہیں۔...... وہ قوم کی ان پرانی عظمتوں کے نوحہ خواں ہیں، جو اَب استبدادِ زمانہ سے فسانہ بن چکی ہیں۔ وہ قوم کو اس غفلت سے بیدار کر کے پھر اس کی بھولی بسری کہانی یاد دلانا چاہتے ہیں۔[۵۵]

۲۔ شاعری میں ان کی زیادہ سے زیادہ اہمیت اتنی ہے کہ انھوں نے بھی اس عہد کے دوسرے شاعروں کی طرح زمانے کے نئے رُخ کو پہچانا اور شاعری میں نیا طرز اختیار کیا۔[۵۶]

۳۔ مذہبی اور قومی شاعری کے علاوہ انھوں نے ایسی غزلیں بھی کہی ہیں، جن میں تغزل پایا جاتا ہے اور بعض جگہ فارسی ترکیبیں اس قدر خوش اسلوبی سے استعمال کی ہیں کہ ان کا کلام

گویا غالب کے کلام سے لگا کھاتا ہے۔[۵۷]

اول الذکر دونوں اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کی شاعرانہ عظمت نہ ہونے کے برابر ہے، لیکن تیسرے اقتباس سے ان کی شاعری کے غالب سے لگا کھانے کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ غالباً وہ یہاں محض رنگِ غالب کی بات کرتے ہیں، عظمت غالب سے اس جملے کو کوئی علاقہ نہیں۔ اس کے برعکس کلام شبلی کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری کا تعلق ایک طرف غالب سے ہے تو دوسری جانب اقبال سے۔ یہاں کلام شبلی سے دیے گئے چند اشعار سے مثال دی جاتی ہے:

وہ بھی تھا ایک دن کہ یہ حسرت سرائے دل
اک حشر نشان ذوق سرور تھا
رنگینی خیال سے لبریز تھا دماغ
جو شعر تھا چراغ شبستان حور تھا
سینہ میں تھا چمن کدۂ صد امید نو
آنکھوں میں کیف بادۂ ناز و غرور تھا[۵۸]

ان اشعار کو مصنف نے رنگِ غالب سے سرشار پایا ہے، جب کہ نیچے دیے گئے اشعار سے اقبال کا رنگ جھلکتا ہے:

کون تھا، جس نے کیا فارس و یوناں تاراج
کس کی آمد میں فدا کر دیا جے پال نے راج
کس کو کسریٰ نے دیا تخت و زر و افسر و تاج
کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج
تجھ پہ، اے قوم! اثر کرتا ہے افسوں جن کا
یہ وہی تھے کہ رگوں میں ہے ترے خوں جن کا[۵۹]

گویا ڈاکٹر ابوسعید نورالدین رنگِ شبلی کی خصوصیات کی نشاندہی میں ناکام رہے ہیں اور انھوں نے عمومی تبصرے سے کام چلایا ہے۔

(۴)

اردو کی ادبی تاریخوں میں سب سے اڈیشن ڈاکٹر سلیم اختر کی اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ہے۔ اس منصوبے کا آغاز ۱۹۶۸ء میں ہوا، ۱۹۷۰ء میں مسودہ مکمل ہو گیا اور ۱۹۷۱ء میں اس کا پہلا اڈیشن منصۂ شہود پر آ گیا؛ البتہ زیرِ نظر کتاب کا اکتیسواں اڈیشن ہے، جو ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا ہے۔

کتاب کے عنوان میں لفظ 'مختصر ترین' اس اختصار کی طرف توجہ دلا رہا ہے، جو مصنف کے پیش نظر ہے، چنانچہ موضوعِ زیرِ بحث سے متعلق بھی کتاب کے محض دو صفحے مختص ہو سکے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی اس تاریخ کا تعلق تحقیق سے زیادہ انشاپردازی سے ہے، چنانچہ اس کے تنقیدی، تجزیاتی یا تاثراتی آرا اپنے اسلوب کی بنا پر زیادہ متوجہ کرتی ہیں۔

۱۔ شبلی کئی معاملوں میں حالی کے برعکس تھے، شاید اسی لیے وہ تمام عمر سرسید کے نظریات کے دائرہ میں محبوس نہ رہ سکے۔[۶۰]

۲۔ وہ اچھے نقاد بھی تھے، بلکہ تحسین شعر اور شاعری سے متعلق مسائل کی تفہیم میں حالی سے بڑھ جاتے ہیں، البتہ جذباتیت کے باعث تنقیدی آرا میں افراط و تفریط کے شکار ہو جاتے ہیں۔[۶۱]

۳۔ پانچ جلدوں پر مشتمل شعر العجم فارسی شاعری کی تاریخ ہی نہیں، بلکہ چوتھی جلد میں شعر، شاعری، محاکات، تخیل، جذبہ اور شاعری اور ماحول کے تعلق پر ژرف نگاہی پر مبنی خیالات کا اظہار کیا، چنانچہ تخیل پر شبلی نے حالی سے کہیں بہتر بحث کی ہے۔[۶۲]

۴۔ شبلی کی [سوانحی] تصانیف دیکھ کر قدم قدم پر ان کی محنت اور جستجو کا احساس ہوتا ہے، اسی لیے یہ کتابیں محض کسی عظیم شخصیت کے کوائفِ زیست کا مجموعہ نہیں، بلکہ اس کے عہد اور معاشرت کی تصویر اور متذکرہ شعبۂ علم کی تاریخ بھی ہیں۔[۶۳]

۵۔ بحیثیت مجموعی عبارت متانت کا رنگ لیے اور عالمانہ شان کی حامل ہے۔ طولِ بیان سے بھی پرہیز کرتے ہیں، بلکہ الفاظ کا اتنا شعور ہے اور ان کے استعمال میں اتنا حسن سلیقہ کہ کم سے کم الفاظ میں بڑے سے بڑے مفہوم کا ابلاغ کر لیتے ہیں۔ اسلوب کے لحاظ سے بھی انھیں حالی پر فوقیت دی جا سکتی ہے۔[۶۴]

ان کے بعض بیانات محض چونکا دینے کے لیے ہیں، مثلاً (۱) 'انگریزی سے واقف تھے، اس لیے سرسید کے کتب خانہ سے خوب استفادہ کیا'،[۶۵] حالانکہ یہ بات درست نہیں اور شبلی براہ راست انگریزی سے استفادے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ (۲) 'انھوں نے ۱۸۹۲ء میں پروفیسر آرنلڈ کی معیت میں مشرق وسطیٰ ترکی اور مصر کی سیر کی'،[۶۶] درست بات یہ ہے کہ آرنلڈ کے یورپی سفر میں استنبول جانے کے لیے شبلی ان کے ساتھ ہو لیے۔ (۳) 'ابھی سیرت النبیؐ کی دو جلدیں ہی چھپ سکیں کہ ان کا انتقال ہو گیا'،[۶۷] جب کہ معلوم ہے کہ سیرت کی ایک جلد بھی ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی، بلکہ اس کی اشاعت کا مرحلہ ان کی رحلت کے بعد سید سلیمان ندوی کے ہاتھوں طے ہوا۔

یقیناً دو صفحات میں اتنی بڑی شخصیت اور اتنے وسیع کام کا احاطہ ممکن نہیں، لیکن ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے خاص اسلوب میں ساری بحث کو سمیٹنے کی کوشش کی، جس میں اگرچہ کامیابی ممکن نہ تھی، البتہ قاری شبلی نعمانی سے متعلق چند ایک بنیادی باتوں سے آگاہ ضرور ہو جاتا ہے۔

(۵)

۱۹۸۳ میں سید احتشام حسین کی مصنفہ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شبلی نعمانی شخصیت اور فکر و فن پر تین صفحات وقف کیے گئے ہیں، جو شبلی جیسے عبقری کے لیے یقیناً ناکافی تھے، لیکن ۳۴۰ صفحات پر اس تاریخ میں اس سے زیادہ کا مطالبہ مناسب بھی نہیں۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ تحقیقی نہیں، بلکہ تنقیدی تاریخ ہے؛ چنانچہ اس میں شبلی

نعمانی سے متعلق بعض وہی باتیں دہرا دی گئی ہیں، جو رام بابو سکسینہ نے لکھی تھیں اور جن کا تحقیقی جائزہ لیا جا چکا ہے۔ احتشام حسین کی چند آرا پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ '۱۸۸۲ء میں شبلی علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد ہو کر چلے گئے'،[۶۸] حالانکہ شبلی جنوری ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج میں ملازم ہوئے اور وہ بھی اسسٹنٹ عربک پروفیسر۔

۲۔ 'آرنلڈ کے ساتھ وہ مصر و شام اور دوسرے اسلامی ممالک بھی گئے'۔[۶۹] اس سلسلے میں اوپر بحث کی جا چکی ہے۔

البتہ ان کے بعض تنقیدی بیانات قابلِ لحاظ ہیں اور ان سے شبلی کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنے میں مدد ملتی رہی ہے:

۱۔ شبلی کے تاریخی نقطۂ نظر اور مذہبی خیالات سے خود ان کے ہم مذہبوں نے اختلاف ظاہر کیا ہے، مگر ادبی تخلیق کے اعتبار سے ان کی بڑی اہمیت ہے۔[۷۰]

۲۔ ان کے ادبی تجزیوں میں غلطیاں بھی ہیں، پھر بھی ان کی ادبی اہمیت سے رُوگرداں نہیں ہو جا سکتا۔[۷۱]

۳۔ شبلی کی تنقیدی سائنسی تو نہیں ہوتی، مگر شعر و ادب سے محظوظ ہونے کے لیے بہت سے راستے دکھاتی ہے۔[۷۲]

۴۔ انھوں نے فلسفیانہ مسائل پر جو کچھ لکھا ہے، اس میں بھی غلطیاں ہیں، مگر اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے پہلے کسی نے بھی مغرب و مشرق کے علما کے خیالات اس طرح جمع نہیں کیے تھے اور نہ ان کو اسلامی فلسفے کے نقطۂ نظر سے دیکھا تھا۔[۷۳]

۵۔ مولانا شبلی کی زبان بڑی پُرکیف، رواں اور رنگین ہوتی ہے۔[۷۴]

۶۔ ان کے مضامین اور مکاتیب کے مجموعے بھی گہرے مطالعے کی چیز ہیں۔ ان سے شبلی کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔[۷۵]

سید احتشام کی دو آرا ایسی ہیں، جو نہایت اہم ہیں، مثلاً (۱) شبلی نے شعر و ادب سے محظوظ

ہونے کی راہ سجھائی ہے اور یہ کہ (۲) انھوں نے مشرق و مغرب کے علما کے خیالات کو پہلی مرتبہ یکجا کیا اور انھیں اسلامی فلسفے کے نقطۂ نظر سے دیکھا، لیکن ان کی طرف سے شبلی کی زبان کو رنگین' قرار دینا بحث طلب ہے اور غالباً یہ خصوصیت ان کی مجموعی نثر سے لگا نہیں کھاتی۔

(۶)

۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر انور سدید کی اردو ادب کی مختصر تاریخ شائع ہوئی، جب کہ دسواں اڈیشن ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے، جن میں سے شبلی کا تذکرہ دسویں باب میں 'شبلی نعمانی' کے تحت صفحہ ۲۸۵ سے ۲۸۷ تک کیا گیا ہے۔

تقریباً دو صفحات پر کسی شخصیت کے خدوخال کسی طور نمایاں نہیں ہو سکتے اور وہ شخصیت اگر شبلی جیسی نابغۂ روزگار ہستی ہو تو مزید دشواری پیش آتی ہے، تاہم اس تاریخ میں چند پیراگراف کے اندر شبلی کی شخصیت کا پورا خاکہ اور اردو ادب میں ان کی خدمات کو جس جامعیت سے پیش کیا گیا ہے، وہ بھی ایک نادر بات ہے۔ ان کے درج ذیل چند جملوں سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

۱۔ شبلی نے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی جنگ پہلے سرسید کے رفیق کی حیثیت میں اور پھر ذاتی حیثیت میں لڑی اور معاشرت، سیاست، مذہب اور ادب پر مستقل اثرات ثبت کیے۔[۷۶]

۲۔ حالی کی خاندانی مفلوک الحالی نے انکسار اور نذیر احمد کی فکر گدائی نے انحصار کے زاویے پیدا کیے تھے، لیکن شبلی کے راجپوتی خون نے حریت پسندی کا راستہ قبول کیا اور اظہار فکر و نظر کے لیے وہ نئے نئے میدانِ حرب و عمل تلاش کرتے رہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی شوکتِ رفتہ کو عہدِ حاضر میں کتابوں میں مجسم کرنے کی سعی کی۔[۷۷]

۳۔ شبلی کے داخل میں جو جمال پسند تخلیق کار موجود تھا، اُس کی جھلک دستۂ گل، بُوئے گل اور برگِ گل کی فارسی تخلیقات میں اور قومی زاویہ دوسری نظموں میں سامنے آتا ہے اور ان سے شبلی کی جذباتی زندگی کے جزر و مد کا گراف بنانا بھی ممکن ہے۔ ان کی شخصیت کے بعض دلآویز

خطوط ان کے مکتوبات، رسالہ الندوہ اور سفرنامۂ روم و مصر و شام سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔[۷۸]

۴۔ شبلی ادیب اور شاعر ہی نہیں، عالم اور مفکر بھی تھے۔ انھوں نے مفکر کی حیثیت میں جو کچھ سوچا، اسے ادیب کی حیثیت میں پیش کیا۔[۷۹]

۵۔ اسلاف کی سوانح سے عہدِ حاضر کے مسلمانوں کو حوصلہ اور قوت عطا کی اور سرسید سے علیحدہ ہوئے تو ان کی علمی جہت کو برقرار رکھتے ہوئے پہلے ندوۃ العلما اور پھر دارالمصنفین قائم کیا۔[۸۰]

۶۔ شبلی رفقائے سرسید میں سے منفرد اسلوب کے ادیب کی حیثیت میں نمایاں ہوئے۔ ان کی نثر داخلی طور پر توانا اور ولولہ انگیز ہے۔ وہ غیر معمولی آرائش کے بغیر ہی قاری کے دل میں اتر جاتے ہیں اور طنز کی ہلکی سی چبھن اس نثر کو عبرت انگیز بنا دیتی ہے۔[۸۱]

انور سدید نے شبلی کی خطوط نگاری ان کی رومانی اسلوب کی آئینہ دار قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ خطوط ان کی جذباتی وارفتگی کو بھی پوری طرح منعکس کرتے ہیں۔ انور سدید غالب کے بعد شبلی کو اردو کا بلند مرتبہ مراسلہ نگار سمجھتے ہیں۔ ان خطوں کے حوالے سے مصنف نے بعض نئی باتیں لکھی ہیں:

> شبلی کے خطوط، ہر چند مقصد کی ڈور میں لپٹے ہوئے ہیں، لیکن ان کے ہاں مقصد کی تکمیل جذباتی آسودگی ہی کا عنوان ہے۔ یہ خطوط ایک ایسے جمال پرست انسان کے ہیں، جو مایوسی سے ہم کنار نہیں ہوتا اور بیداری کے خوابوں کو بیان کرنے کا حوصلہ رکھنے کے علاوہ ان کی تعبیر دیکھنے کا بھی آرزومند ہے۔ وہ اپنے خطوط میں مجسم مسرت و انبساط نظر آتے ہیں اور اچھی کتاب، اچھا لطیفہ اور خوب صورت جملہ ان کی رگوں میں خون کی گردش تیز کر دیتا ہے۔ عطیہ کے نام ان کے خطوط اسی مزاج کے عکاس ہیں۔[۸۲]

البتہ انھوں نے اس خیال کی تردید کی ہے کہ 'شبلی عورتوں کو خطوط لکھنے والے پہلے ادیب تھے۔ ان کی تحقیق کے مطابق 'ان سے قبل واجد علی شاہ اس صنف میں اپنا سکہ قائم کر چکے تھے'۔[۸۳]

صفحہ ۳۰۹ پر مصنف نے 'سفرنامہ' کی ذیل میں سفرنامۂ روم و مصر و شام کو شبلی کی علمی

جستجو کا مظہر اور ان کی داخلی جستجو کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ انور سدید کا کہنا بجا ہے کہ کتاب کی جذباتی دردمندی پر اس کا علمی مرتبہ غالب آ گیا ہے۔

اس نہایت مختصر تحریر میں انور سدید نے مطالعہ شبلی میں جو نتائج برآمد کیے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس موضوع پر مفصل لکھتے تو تنقید شبلی میں کئی نئے در وا ہو سکتے ہیں۔

(۷)

تبسم کاشمیری کی رجحان ساز اردو ادب کی تاریخ، جسے بجا طور پر اردو زبان و ادب کی تواریخ کا سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے، ۲۰۰۳ء میں سنگ میل لاہور کی طرف سے منصۂ شہود پر آئی۔ اگرچہ اس تاریخ کی حدود ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک ہیں اور ظاہر ہے کہ شبلی کی ادبی خدمات کا تعلق بعد کے دور سے ہے، تاہم مصنف نے شبلی نعمانی کی تصانیف شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کی بعض تنقیدی آرا سے استفادہ کیا ہے، اس وقت انھی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

کتاب کے باب نہم 'شمالی ہند میں نئی لسانی روایت کا آغاز اور محرکات' میں ایہام گوئی کی تحریک کے تحت دلّی کی ادبی فضا پر صائب اور بیدل کے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ اس مقام پر ڈاکٹر تبسم نے لفظوں کے در و بست اور نشست و برخاست کے حوالے سے اُس وقت کے فارسی شعرا کے بارے میں شبلی کے اس بیان کو پیش کیا، یعنی 'قدما اور متوسطین کسی خیال کو پیچیدگی سے نہیں ادا کرتے تھے۔ متاخرین کا یہ خاص انداز ہے کہ جو بات کہتے، پیچ دے کر کہتے'۔[۸۴] اسی طرح درد کی شاعری پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم شبلی کے اس بیان سے اپنی بات پر زور دیتے ہیں کہ 'وحدت الوجود بادۂ تصوف کا نشہ ہے'۔[۸۵]

انیس و دبیر پر گفتگو کرتے ہوئے شبلی کو نظر انداز کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ شبلی سے اتفاق کریں یا اختلاف، انیس و دبیر پر بات مکمل ہی نہیں ہوتی، جب تک شبلی کے خیالات زیر بحث نہ آئیں۔ اس کتاب کی اشاعت سے اب تک اس پر شدید ردّعمل منظر عام پر آ چکا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوئی؛ چنانچہ ڈاکٹر تبسم کے ہاں بھی اس کتاب سے استفادے کی کئی ایک مثالیں سامنے آتی ہیں۔

ڈاکٹر تبسم نے کتاب کے باب 'انیس' مرثیہ: لکھنؤ کی مذہبی ثقافت کا ایک مظہر' میں انیس و دبیر کا موازنہ کرتے ہوئے دبیر پر شبلی کے اعتراضات کا ذکر کیا اور ان کا خلاصہ پیش کر کے سید عابد علی عابد کے مقدمہ موازنہ سے ان کا جواب دیا اور دلیل میں ایک طویل اقتباس درج کیا؛ لیکن وہ خود عابد علی عابد سے متفق نہ ہو سکے اور اپنے تاریخی شعور اور مؤرخانہ نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے شبلی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ لکھتے ہیں:

> کسی شاعر کی فنی عظمت کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ وہ اپنے تخلیقی سرمایے کے ساتھ کس حد تک نئے ادوار میں داخل ہو کے آگے جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے اگر دبیر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی کے آغاز ہی سے اس کے قدم ادبی تاریخ کے سفر میں لڑکھڑانے لگتے ہیں۔[۸۶]

شبلی نعمانی کے تنقیدی خیالات سے استفادہ اور دبیر سے متعلق ان کے خیالات کی خاموش تائید سے ڈاکٹر تبسم کے ہاں شبلی کے تنقیدی افکار کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

(۸)

اردو زبان و ادب کی ایک اہم تاریخ، جسے ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک شاندار علمی کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے، تاریخ ادب اردو ہے، جس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے اس تاریخ کی جلد اوّل ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی، دوسری ۱۹۸۲ء میں، تیسری جون ۲۰۰۶ء میں اور تیسری جلد ۲۰۱۲ء میں منصۂ شہود پر آئی۔

جلد اوّل میں شبلی کی شعر العجم کا ایک حوالہ ہے، جلد دوم میں شعر العجم اور مقالات شبلی سے ایک ایک، جلد سوم میں موازنہ انیس و دبیر سے دو اور جلد چہارم میں موازنہ انیس و دبیر کا حوالہ 'میر ببر علی انیس' میں نو مرتبہ اور 'مرزا سلامت علی دبیر' میں تین دفعہ دیا گیا ہے۔

اب تک علامہ شبلی نعمانی پر سب سے جامع مقالہ زیر نظر تاریخ کی چوتھی جلد میں ملتا ہے، جو کتاب کے صفحہ ۱۰۵۹ سے ۱۱۰۷ کو محیط ہے اور ۱۱۳ حوالوں سے مزین ہے۔ ڈاکٹر

جمیل جالبی نے اس باب کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے؛ یعنی 'تمہید، حالاتِ زندگی، عطیہ فیضی، شخصیت و مزاج'، 'شبلی کی تصانیف' (علم الکلام اور شبلی، شبلی اور تاریخ نویسی، ادب اور تنقید، شبلی کی نثر نگاری اور طرزِ ادا) اور 'شبلی کی شاعری'۔

مقالے کے پہلے ذیلی عنوان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی ابھی تک امین زبیری اور وحید قریشی کے زیرِ اثر ہیں، ورنہ مقالے کی ابتدا میں عطیہ فیضی کا نام ٹانکنا کچھ ایسا ضروری نہیں تھا کہ جس کے بغیر شبلی نعمانی کی شخصیت مکمل نہ ہوتی۔ اگر شبلی کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے عطیہ واقعی اہم ہیں تو سر سید، علی گڑھ، ندوۃ العلما اور دار المصنفین کا تذکرہ بھی اسی جگہ ہونا چاہیے تھا، کیونکہ شبلی کی شخصیت پر ان سب کے عطیہ فیضی سے زیادہ اثرات ہیں۔

ابتدائی حصے میں بالعموم حیاتِ شبلی، مکاتیبِ شبلی، سفرنامہ روم و مصر و شام، خطوطِ شبلی سے کام لیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ حصہ بہت مفصل ہے اور اس سے شبلی کے سوانح، شخصیت اور ذہنی و فکری ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، لیکن اس میں تقدیم و تاخیر کا لحاظ کم ہی رکھا گیا ہے؛ بالخصوص عطیہ فیضی سے تعلق اور گزیدِ پا کا واقعہ زمانی اعتبار سے اپنے اپنے مقام پر نہیں۔ شبلی کی شخصیت سازی پر لکھتے ہوئے بھی مختلف خیالات کو یکجا کر دیا گیا ہے اور اس میں حسنِ ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔

اوّل اوّل جملہ تصانیف کا مختصراً تعارف کرایا گیا ہے، جس کے بعد ان تصانیف کا مختلف شعبوں کے اعتبار سے الگ الگ جائزہ لیا گیا ہے۔ 'علم الکلام اور شبلی' بجائے خود ایک اعلیٰ تنقیدی مضمون کا درجہ رکھتا ہے۔ بلاشبہ یہ مضمون اپنے موضوع پر ایک ایسی تحریر ہے، جس پر اضافہ بہت مشکل ہے۔ اس حصے میں شبلی کی تمام کلامی کتب (علم الکلام، الکلام، الغزالی اور سوانح مولانا روم) کا بہت اچھا تجزیہ کیا گیا ہے۔ علم الکلام، الکلام کے حوالے سے رائے قائم کرتے ہوئے مصنف نے اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> اس میں شک نہیں کہ موجد کی حیثیت سے مولانا نے غلطیاں بھی کی ہیں، مگر اس سے ان کی جدت اور اوّلیت کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ ...... یہ بات مسلّم ہے کہ

> علم الکلام اور الکلام اردو میں اپنی قسم کی پہلی تصانیف ہیں اور انھیں مذہب کو جدید روشنی میں قائم رکھنے کی اہم ترین کوششوں میں شمار کرنا چاہیے۔[۸۷]

جالبی الغزالی اور سوانح مولانا روم کو علم الکلام کی کتابیں قرار دیتے ہیں اور ان کی سوانحی حیثیت سے مطمئن نہیں ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں۔

> ان کے نزدیک، امام غزالی جدید علم کلام کے موجد ہیں اور اس لیے اس کتاب میں وہ اپنی توجہ علم کلام پر مرکوز رکھتے ہیں۔...... اگر الغزالی کو سوانح کے معیار سے دیکھا جائے تو اس میں مسلمانوں کے سب سے اہم فلسفی امام غزالی کے علم اور ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیا گیا، اس لیے جدید سوانح نگاری کے معیار پر یہ پوری نہیں اترتی۔[۸۸]
>
> محسوس ہوتا ہے کہ مولانا روم کی مثنوی کا مطالعہ کرتے ہوئے علم کلام ان کے ذہن پر اس درجہ سوار تھا کہ وہ فارسی شاعری کا اعلیٰ مذاق رکھنے کے باوجود، مثنوی کی جادو بیان شاعری کو نہیں دیکھ پائے اور اس میں سے علم کلام نکال کر رہ گئے، جو اس میں ضرور ہے، لیکن شاعری کے جادو پر فوقیت نہیں رکھتا۔[۸۹]

جمیل جالبی کو شبلی کی تاریخ نویسی پر بھی کئی ایک اعتراضات ہیں۔ ان کے خیال میں 'تاریخ نویسی میں بھی مذہب و ملت سے ان کی گہری دلچسپی نمایاں رہتی ہے اور ان کی تاریخ بھی علم کلام کے دائرے میں رہتی ہے'[۹۰] اور یہ کہ 'ان کی تاریخی تصانیف میں مخالف رایوں پر بحثیں ملتی ہیں اور اکثر 'تاریخ' غیر جانب دارانہ رویہ پیش کرنے کے بجائے دفاعی استدلال پیش کرتی ہے'۔[۹۱] دوسری جانب یورپی تاریخی کتب کے مطالعات کی وجہ سے شبلی سے جو توقعات رکھتے ہیں، وہ پوری نہیں ہوتیں؛ چنانچہ تقریباً سات صفحات پر محض یہی سمجھا سکے کہ 'ان کی تاریخی تصانیف پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ عقیدہ کی بنا پر جو بات ان کے دل میں بیٹھ گئی ہے، وہ اس کے خلاف بات پر استدلال کرنے میں لگے ہوئے ہیں'۔[۹۲]

جمیل جالبی نے شبلی کی تاریخی تصانیف کو دو دو حصوں میں منقسم قرار دیا ہے، یعنی ایک حصے میں واقعات یا حالاتِ زندگی اور دوسرے میں اخلاق و عادات اور کارناموں کی

تفصیل۔ وہ پہلے حصے کو قدما کے انداز سے قریب سمجھتے ہیں، جب کہ دوسرے حصے کو جدید طرز سے؛ البتہ الفاروق کو تاریخ نگاری کا شاہکار تسلیم کرتے ہیں۔[۹۳]

یہ حصہ شبلی کی تاریخ نویسی پر تنقید سے زیادہ اعتراضات سے بھرا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے، جالبی کسی طور شبلی کی تاریخ نویسی کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں، چنانچہ ہر پیراگراف میں وہ کوشاں ہیں کہ کسی طرح شبلی کی مؤرخانہ حیثیت کو کم سے کم کیا جا سکے۔

اس مقالے کا ایک اور جاندار حصہ 'ادب اور تنقید' ہے، جس میں موازنۂ انیس و دبیر، شعرالعجم، مقالات اور مکاتیب میں شبلی کی تنقیدی آرا کی روشنی میں شبلی کی انتقادی صلاحیتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ کہنا بجا ہے کہ 'حالی انگریزی معیار ادب کو اپنا کر اس میں مشرقی طرز تنقید کو ملاتے ہیں، ان کے برخلاف شبلی مشرقی معیار تنقید کو بنیاد بنا کر اس میں مغربی فکر کا امتزاج کرتے ہیں۔'[۹۴]

جمیل جالبی بھی انیس کی طرف داری کے حوالے سے معترض ہیں، تاہم ان کا یہ کہنا درست ہے کہ 'شبلی انیس کی طرف داری کی وجہ سے موازنہ میں تو کامیاب نہیں ہیں، لیکن خود انیس کا مطالعہ عملی تنقید کا بہترین نمونہ ہے'[۹۵] اور یہ کہ 'آج شبلی کی یہ تصنیف میر انیس و مرزا دبیر کے موازنہ کے طور پر اہمیت نہیں رکھتی، لیکن اس کی اصلی اہمیت یہ ہے کہ اس میں جس طرح کلام انیس کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے، وہ نیا اور اچھوتا ہے۔'[۹۶]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شعرالعجم کے جملہ مندرجات پر جامع گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ کہنا بہت اہمیت رکھتا ہے کہ 'شعرالعجم میں سن، تاریخ، حالات و واقعات کی صحت سے زیادہ شاعروں اور اصناف سخن کے تنقیدی جائزہ پر زور دیا گیا ہے۔ یہی تنقیدی مطالعے شعرالعجم کی جان ہیں'[۹۷] اور یہ کہ 'شعرالعجم میں مختلف زاویوں سے اضافے کیے جا سکتے ہیں، مگر فارسی شاعری کا ذوق پیدا کرنے اور فارسی شاعری کی روایت کے اصول جاننے کے لیے شبلی سے بہتر رہبر مشکل سے ملے گا۔'[۹۸]

شبلی کی تنقیدات میں ان کے مقالات کی افادیت سے بھی انکار نہیں۔ ڈاکٹر جالبی نے مقالات کے حوالے سے چند اشارات میں ان کی تنقیدی حیثیت کا تعین کر دیا ہے، لکھتے ہیں:

> ایک یہ کہ 'تاریخ' ان کے مزاج کا جزو اعظم ہے، دوسرے 'اسلامی جذبہ' ان کے خون کے ساتھ گردش کر رہا ہے، تیسرے یہ کہ علم و ادب کے تعلق سے مسائل حاضرہ میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور چوتھی بات یہ کہ وہ نئے سے نئے موضوع یا مسئلہ کو بغیر کسی ابہام کے، اپنے منفرد طرز میں ادا کرنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔[۹۹]

پہلی اور دوسری خصوصیت کو جالبی کا تکیہ کلام قرار دینے کے باوجود، درج بالا آرا کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا؛ چنانچہ شبلی کی تنقیدی حیثیت کے بارے میں ان کا یہ کہنا حرف آخر قرار دیا جا سکتا ہے:

> شبلی کے ہاں اصول تنقید تفصیل کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور عملی تنقید میں بھی مذاق سخن اس طرح نمایاں ہوتا ہے کہ شعر و ادب کا ایسا ستھرا ذوق کہیں اور مشکل سے دکھائی دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ ان کی ادبی تنقید میں فکری عناصر بھی نمایاں ہیں اور کلامی مزاج کے باوجود تنگ دلی اور شدت کا پتا نہیں چلتا۔[۱۰۰]

شبلی کی متنوع موضوعات سے متعلق تحریروں میں ان کی انفرادیت تلاش کی جائے تو وہ ان کا اسلوب نگارش ہے، چنانچہ ڈاکٹر جالبی نے ان کی نثر نگاری اور طرز ادا کی خصوصیات کو پانچ اجزا کا مرکب قرار دیا ہے، یعنی قدیم طرز انشا، جدید سادگی و صفائی، استدلالی رنگ، شاعرانہ انداز اور فن کاری۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ان کی زبان علم کے سرمایے سے مالا مال ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب کا بہترین حصہ ان کی تخیل کی ملکیت میں آ گیا ہے۔ شبلی اس اعتبار سے اردو نثر کے وہ فن کار ہیں، جو نثر میں حسن پیدا کر کے اسے آرٹ بنا دیتا ہے۔ ان کا ذہنی منطقی ترتیب کا پروردہ ہے۔ استدلال ان کا مزاج ہے، اسی لیے شبلی کے ہاں جملے کی ساخت بھی پوری طرح مرتب ہے۔ اسلوب کا نقص ہمیشہ منطق کا نقص ہوتا ہے، شبلی کا طرز ادا اس نقص سے منزا ہے۔[۱۰۱]

مقالے کا آخری جزو 'شبلی کی شاعری' مجموعی طور پر مقالے کا کمزور ترین حصہ قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں شبلی کی اردو اور فارسی شاعری پر مفصل گفتگو نہیں کی جا سکی: البتہ شبلی نے مقالے کے پہلے ذیلی عنوان میں عطیہ کے نام کو شامل کیا تو آخر صفحے پر عطیہ کو فراموش نہ کر سکے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی عطیہ کے بغیر علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کو سمجھنے پر تیار نہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ مقالہ اپنے اندر بہت سی خوبیوں کے باوجود شبلی کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے بارے میں بعض تعصبات سے عبارت ہے۔ مقالے کے مختلف حصوں میں توازن قائم نہیں رکھا جا سکتا اور بعض آرا جا بجا دخل اندازی کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ دوران مطالعہ احساس ہوتا ہے کہ مقالہ نگار شبلی کے مذہبی لگاؤ، ان کے کلامی مزاج اور عطیہ فیضی سے تعلق کی تکون سے باہر نہیں نکل سکا۔ شبلی پر ہونے والے اب تک کے تحقیقی، تنقیدی اور فکری کام کے بعد زیر نظر تاریخ میں ایک بہتر مقالے کی توقع کی جا سکتی تھی، جو بوجوہ پوری نہ ہو سکی۔

اردو زبان و ادب کی تواریخ میں سے رام بابو سکسینہ، حامد حسن قادری، ڈاکٹر ابو سعید نورالدین، ڈاکٹر سلیم اختر، سید احتشام حسین، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے ہاں کسی نہ کسی درجے پر شبلی کی شخصیت اور فکر و فن پر تنقیدی جائزہ ملتا ہے۔ شبلی پر رام بابو سکسینہ کے ہاں ابتدائی تنقیدی جملے خاصے اہم ہیں، بعد ازاں ڈاکٹر سلیم اختر، سید احتشام حسین اور ڈاکٹر انور سدید کے ہاں بھی مختصر گفتگو ملتی ہے؛ البتہ مولانا حامد حسن قادری اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے ہاں علامہ کی شخصیت اور علمی و ادبی فتوحات پر مفصل اور جامع تحقیقی و تنقیدی تبصرے ملتے ہیں۔ ان میں صرف حامد حسن قادری کے ہاں ایک متوازن رویہ ملتا ہے اور انھوں نے علامہ شبلی نعمانی پر لکھتے ہوئے غیر جانب دارانہ اور معروضی نقطہ نظر اپنایا ہے۔

❁

۱۔ رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا محمد عسکری، لاہور: علمی کتاب خانہ، ۱۹۹۴ء، ص ۴۲۶
۲۔ ایضاً، ص ۴۲۸
۳۔ ایضاً، ص ۴۳۴، ۴۳۵
۴۔ ایضاً، ص ۴۳۵
۵۔ ایضاً
۶۔ ایضاً، ص ۴۲۸
۷۔ ایضاً
۸۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی: کتابیات شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۹
۹۔ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۶
۱۰۔ رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو بحولہ بالا ۱، ص ۴۲۹
۱۱۔ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی بحولہ بالا ۹، ص ۱۵۳
۱۲۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی: کتابیات شبلی بحولہ بالا ۸، ص ۲۹
۱۳۔ رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو بحولہ بالا ۱، ص ۴۲۹
۱۴۔ شبلی نعمانی: سفر نامہ روم و مصر و شام، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۹
۱۵۔ رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو بحولہ بالا ۱، ص ۴۳۴
۱۶۔ حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، سوم ۱۹۸۸ء، ص ۲۳
۱۷۔ ایضاً، ص ۳
۱۸۔ گیان چند، ڈاکٹر: اردو کی ادبی تاریخیں، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص ۹۱۳
۱۹۔ ایضاً
۲۰۔ ایضاً
۲۱۔ ایضاً
۲۲۔ حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو بحولہ بالا ۱۶، ص ۷۴۳
۲۳۔ ایضاً، ص ۷۴۳
۲۴۔ ایضاً، ص ۷۴۶
۲۵۔ ایضاً، ص ۷۴۷
۲۶۔ ایضاً، ص ۷۴۶
۲۷۔ ایضاً، ص ۷۴۷
۲۸۔ ایضاً، ص ۷۴۹

۲۹۔ ایضاً،ص۷۵۳
۳۰۔ ایضاً،ص۷۵۹
۳۱۔ ایضاً
۳۲۔ ایضاً،ص۷۶۲-۷۶۳
۳۳۔ ایضاً،ص۷۶۶
۳۴۔ ایضاً،ص۷۷۲
۳۵۔ ایضاً،ص۷۸۱
۳۶۔ ایضاً،ص۷۸۶-۷۸۷
۳۷۔ ایضاً،ص۸۶۳
۳۸۔ ایضاً،ص۸۸۹
۳۹۔ ڈاکٹر ابوسعید نورالدین: تاریخ ادبیات اردو، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء، ص۱۲
۴۰۔ ایضاً،ص۱۳
۴۱۔ ایضاً،ص۲۱۴
۴۲۔ ایضاً،ص۲۱۵
۴۳۔ ایضاً
۴۴۔ ایضاً،ص۲۱۹
۴۵۔ ایضاً
۴۶۔ ایضاً،ص۲۲۵
۴۷۔ ایضاً،ص۲۲۶
۴۸۔ ایضاً
۴۹۔ ایضاً،ص۲۲۷
۵۰۔ ایضاً
۵۱۔ ایضاً
۵۲۔ ایضاً
۵۳۔ ایضاً
۵۴۔ ایضاً
۵۵۔ ایضاً،ص۸۷۷
۵۶۔ ایضاً،ص۸۷۸

۵۷۔ ایضاً
۵۸۔ ایضاً۔ کلیاتِ شبلی اردو (اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۷ء، ص۱۱۴) میں پہلے شعر کے مصرع اولی میں 'حسرت' کے بجائے 'وحشت' اور مصرع ثانی میں 'نشان' کی جگہ 'نشاط' لکھا گیا ہے۔
۵۹۔ ایضاً،ص۸۷۷۔ شبلی نعمانی: کلیاتِ شبلی اردو، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۷ء، ص۳۹
۶۰۔ ڈاکٹر سلیم اختر: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، اکتیسواں اڈیشن 2015ء، ص۳۲۹
۶۱۔ ایضاً
۶۲۔ ایضاً،۳۳۰
۶۳۔ ایضاً
۶۴۔ ایضاً
۶۵۔ ایضاً،ص۳۲۹
۶۶۔ ایضاً،ص۳۳۰
۶۷۔ ایضاً
۶۸۔ سید احتشام حسین: اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ہشتم ۲۰۱۱ء، ص۱۹۵
۶۹۔ ایضاً،ص۱۹۶
۷۰۔ ایضاً،ص۱۹۷
۷۱۔ ایضاً
۷۲۔ ایضاً
۷۳۔ ایضاً
۷۴۔ ایضاً
۷۵۔ ایضاً
۷۶۔ ڈاکٹر انور سدید: اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، دہم ۲۰۱۳ء-۲۰۱۴ء، ص۲۸۶
۷۷۔ ایضاً،ص۲۸۶
۷۸۔ ایضاً،ص۲۸۷
۷۹۔ ایضاً
۸۰۔ ایضاً
۸۱۔ ایضاً
۸۲۔ ایضاً،ص۳۰۷

۸۳ ایضاً
۸۴ ڈاکٹر تبسم کاشمیری: اردو ادب کی تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۲۶۳
۸۵ ایضاً، ص ۳۵۰
۸۶ ایضاً، ص ۱۸۵
۸۷ ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۷۹
۸۸ ایضاً، ص ۱۰۸۰
۸۹ ایضاً، ص ۱۰۸۲
۹۰ ایضاً
۹۱ ایضاً
۹۲ ایضاً، ص ۱۰۸۶
۹۳ ایضاً، ص ۱۰۸۸
۹۴ ایضاً، ص ۱۰۸۹
۹۵ ایضاً، ص ۱۰۹۲
۹۶ ایضاً
۹۷ ایضاً، ص ۱۰۹۳
۹۸ ایضاً، ص ۱۰۹۵
۹۹ ایضاً، ص ۱۰۹۶
۱۰۰ ایضاً، ص ۱۰۹۰
۱۰۱ ایضاً، ص ۱۱۰۳

□□□

مصنف کی چند دیگر تصانیف وتالیفات

- میرے فیض تک — لاہور ۱۹۹۹ء، دہلی ۲۰۰۳ء
  میرے فیض تک: جہانِ تلمیحات — لاہور ۲۰۱۶ء
- انتخاب ولی دکنی — لاہور ۲۰۰۲ء
- ایسے ہوتے ہیں وہ تارے — لاہور ۲۰۰۳ء
- جھوٹا سب سنسار — لاہور ۲۰۰۵ء
- حضورؐ بحیثیت سپہ سالار — لاہور ۲۰۰۶ء، ۲۰۰۸ء، دہلی ۲۰۱۳ء
- شگفتہ افسانے — لاہور ۲۰۰۶ء
- اختر حسین رائے پوری، حیات وخدمات — لاہور ۲۰۰۹ء
- مکاتیب ابن فرید — لاہور ۲۰۱۰ء
- اقبالیاتی مکاتیب — راولپنڈی ۲۰۱۲ء
- رقعاتِ مشفق خواجہ — لاہور ۲۰۱۲ء
- ارمغانِ رفیع الدین ہاشمی — راولپنڈی ۲۰۱۳ء
- نگارشاتِ شمیم — کراچی ۲۰۱۴ء
- شبلی کی آپ بیتی — لاہور ۲۰۱۴ء، اعظم گڑھ ۲۰۱۴ء
- آپ بیتی علامہ اقبال — لاہور ۲۰۱۵ء، کلکتہ ۲۰۱۵ء
- اردو ترجمہ مکاتیب شبلی — اعظم گڑھ ۲۰۱۶ء
- شبلی شکنی کی روایت — لاہور ۲۰۱۹ء
- تسہیل فتح الحمد — زیرِ طبع
- اردو ادب کی چند روایات — زیرِ طبع
- مکاتیب اقبال بنام خواتین — زیرِ طبع

مصنف کی چند دیگر تصانیف و تالیفات

○ میرے فیض تک	لاہور ١٩٩٩ء، دہلی ٢٠٠٣ء
میرے فیض تک: جہانِ تلمیحات	لاہور ٢٠١٦ء
○ انتخابِ ولی دکنی	لاہور ٢٠٠٢ء
○ ایسے ہوتے ہیں دو نامے	لاہور ٢٠٠٤ء
○ جھوٹا سب سنسار	لاہور ٢٠٠٥ء
○ حضورؐ بحیثیت سپہ سالار	لاہور ٢٠٠٦ء، ٢٠٠٨ء، دہلی ٢٠١٣ء
○ شگفتہ افسانے	لاہور ٢٠٠٦ء
○ اختر حسین رائے پوری: حیات و خدمات	لاہور ٢٠٠٩ء
○ مکاتیب ابن فرید	لاہور ٢٠١٠ء
○ اقبالیاتی مکاتیب	راولپنڈی ٢٠١٢ء
○ رقعاتِ مشفق خواجہ	لاہور ٢٠١٢ء
○ ارمغانِ رفیع الدین ہاشمی	راولپنڈی ٢٠١٣ء
○ نگارشاتِ شمیم	کراچی ٢٠١٤ء
○ شبلی کی آپ بیتی	لاہور ٢٠١٤ء، اعظم گڑھ ٢٠١٤ء
○ آپ بیتی علامہ اقبال	لاہور ٢٠١٥ء، کلکتہ ٢٠١٥ء
○ اردو ترجمہ مکاتیبِ شبلی	اعظم گڑھ ٢٠١٦ء
○ شبلی شکنی کی روایت	لاہور ٢٠١٦ء
○ تسہیل فتح المحمد	زیر طبع
○ اردو ادب کی چند روایات	زیر طبع
○ مکاتیبِ اقبال بنام خواتین	زیر طبع

عزیزی ڈاکٹر خالد ندیم بھی خوب ہیں، ابھی فارغ ہی نہیں بیٹھتے۔ اس لیے لگتا ہے محشر میں بھی ان کا عمل کچھ اس سے مختلف نہ ہوگا۔ ہمیشہ سرگرم، اور کیا نہیں ہے ان کی سرگرمیوں میں، جو عبارت ہیں محض قرطاس و قلم کے رشتے سے، جن کے اظہار و نتائج میں ہمیں تخلیق بھی نظر آتی ہے، تنقید بھی اور تالیف و تدوین بھی۔ جب کہ مزاج پر تحقیق اور اس کا عشق چھایا رہتا ہے، جو ادھر چند برسوں سے کسی نہ کسی شکل میں ان کی ہر کاوش میں ضرور جھلکتا ہے، چاہے وہ میرے فیض تک یا اختر حسین رائے پوری تک کے مطالعات ہوں یا تلاش و تدوین مکاتیب ہوں یا خود نوشتوں کی بصورت حاضر تالیفات ہوں، تحقیقی مزاج و عمل کے عشق سے وہ اب دور نہیں رہتے۔ ان کا یہی عشق انھیں اقبال سے ہے، جو انھیں ان کے مکاتیب و سوانح کی تدوین سے آگے بڑھ کر اب عہد حاضر کے فکری بحران کا حل اقبال کے زاویے سے تلاش کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ پھر ایسا ہی عشق انھیں شبلی کے دام میں بھی اسیر کیے ہوئے ہے، جس نے ان سے پہلے شبلی کی آپ بیتی تالیف کرائی اور پھر شبلی کے مکاتیب کا اردو میں ترجمہ کرایا اور اب شبلی شکنی کی روایت کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ ظاہر ہے شبلی جیسے نابغہ کے بارے میں کہ جو ادب، تنقید، تحقیق، شاعری اور تاریخ کے ہر ہر باب میں 'کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست' کے مصداق ہو، اب یہ دیکھنا کہ وہ کیوں اور کیسے تنقید و مخالفت کا نشانہ بنے؟ اس تنقید و مخالفت یا شبلی شکنی کا پس منظر کیا تھا اور اس کی نوعیت کیا رہی؟ یہ بڑے سوالات ہیں اور دردانگیز بھی۔ ان ہی دردانگیز سوالوں کا جواب تلاش کرنا خالد ندیم صاحب کی زیر نظر تصنیف کا مقصد ہے۔

موضوع کا انتخاب ہی ایک دردمندانہ احساس کا نتیجہ ہے، جو شبلی سے ان کے والہانہ عشق کا سبب ہے۔ ہمارے اکابر قوم و ملت اور سیاست میں کون ایسا رہبر و رہنما گزرا ہے، جس پر تنقید نہیں ہوئی یا جس کی مخالفت نہ ہوئی ہو، لیکن دکھ ہوتا ہے جب مخالفت محض برائے مخالفت ہوتی ہے اور اس کے پس پشت بسا اوقات اپنے اپنے زاویے اور نظریے سے بے بنیاد اتہام تراشی کو تاریخ ہر دور میں دیکھتی رہی ہے۔ شبلی کے ساتھ اس ضمن میں کیا ہوا؟ اور ہمارے نمائندہ اکابر مصنفین کا رویہ کیا تھا؟ اور ان کی جانب سے ان کے رویے کی نوعیت کیا تھی؟ زیر نظر تصنیف میں خالد ندیم صاحب نے بلا کم و کاست اس کا مطالعہ و تجزیہ کیا ہے۔ اس مطالعے کا انداز اور اسلوب بہت سلجھا ہوا، متوازن اور میانہ روی پر استوار ہے۔ یہ ایسا ہے کہ اس مطالعے میں خالد ندیم صاحب بالعموم کہیں جانب دار یا جذباتی نہ ہوئے اور بہت سنجیدگی اور شائستگی سے رویوں اور عمل و ردعمل کو جانچا اور پرکھا ہے اور پھر اپنی رائے دی ہے یا خود ہم اسے پڑھتے ہوئے ایک مناسب رائے قائم کرنے کے مرحلے پر پہنچ جاتے ہیں۔ موضوع وسیع تھا، لیکن اسے مزید پھیلایا بھی جا سکتا تھا اور مزید رویے اور عمل و ردعمل تلاش کیے جا سکتے تھے، لیکن انھوں نے بہت حد تک اپنے مطالعے کو نمائندگی اور محض قابل ذکر یا بہت اہم مباحث و امثال تک محدود رکھا ہے، جو قابل ستائش ہے، ورنہ جذباتیت کی رو میں اگر وہ بہتے تو نہ جانے کہاں کہاں کی خبر لے آتے اور کس کس کا کیا کیا حشر کر دیتے، مگر انھوں نے بے حد جامعیت اور توازن و سنجیدگی کو ہمیشہ اور ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے۔ یہ ایک بڑا وصف ہے اس انداز کے مطالعات میں جس کا خالد ندیم صاحب نے پورا پورا لحاظ رکھا ہے، جس کے سبب یہ تصنیف شبلی کے تعلق سے اور اس نوع کے مطالعات کے زمرے میں ایک قابل تحسین اضافہ بھی جانی چاہیے۔

معین الدین عقیل